
ردّ وہابیہ
مصنفہ
مرجع المومنین آیۃ اللہ الحاج
علی نقی النقوی
مدظلہ العالی

ردّ وہابیہ

مشتمل بر ترجمہ و اضافات

(کتاب عربی)

"کشفُ النقاب عن عقائد ابن عبد الوہاب"

== ازقلم ==

حضرت سیّد العلماء الحاج

مولانا سیّد علی نقی نقوی

مدظلہ العالی

طابع :- میر احمد علی رضوی
ناشر: سرفراز حسین جھبر

پہلا ایڈیشن، جنوری سنہ ۱۹۸۶ء

قیمت

۱۵
[redacted] روپے

ملنے کا پتہ:
سرفراز حسین جھبر
احمد بلڈنگ (بسم اللہ ہوٹل کے اوپر) چوتھا منزلہ
مولانا آزاد روڈ - بمبئی ۸
400008

خلاصہ و اظہارِ تشکر

زیر نظر کتاب "رَدِّ وَهابیہ" دراصل عربی کتاب "کَشفُ النقَاب" کا اُردو ایڈیشن ہے۔

اور کشف النقاب وہ نادر و نایابِ روزگار کتاب ہے جو سرکار سیّد العلماء مدظلہ العالی نے اپنی زمانۂ طالب علمی میں رواقِ سید الشہداء اور روضۂ نجف اشرف میں قیام فرما کر تحریر فرمائی تھی کتاب کتنی مستند و جامع ہے اس کا فیصلہ خود اہلِ علم و اہلِ نظر فرمائیں گے۔

ع ؎ اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

اس نایابِ زمانہ کتاب کا ایک نسخہ بمبئی میں آقای رجبی مدظلہ (پیش نماز مسجد ایرانیان المعروف بہ مغل مسجد) کے پاس موجود تھا جو موصوف نے میرے کہنے پر جناب محمد صادق کے ذریعے اس خواہش کے ساتھ مجھے مرحمت فرمایا کہ اس کی اشاعت اُردو کے علاوہ عربی زبان میں دوبارہ ہو۔

اور جب میری خواہش اور ضد کے پیشِ نظر سرکار سید العلماء مدظلہٗ نے از راہِ تلطف و خرد نوازی اپنی عدیم الفرصتی، پیرانہ سالی اور ناسازئ مزاج کے باوجود عربی مسودے پر نظرِ ثانی فرما کر اور اردو کتاب کو از سرِ نو ترتیب دیکر اور تہران میں مکمل فرما کے مجھے عنایت فرمایا تو میں نے عربی متن کی ایک زیروکس کاپی آقای رجبی کے پاس بھیجی تاکہ وہ آقای الحاج سید محمد موسوی (وکیل آیۃ اللہ الخوئی مدظلہٗ العالی مقیم بمبئی) سے اپنے خاص الخاص روابط کی بنا پر اس کی اشاعت کے لیے مدد لیں۔ لیکن آقای موسوی نے بربنائے مصلحت، یا بربنائے مجبوری یا بربنائے "ناقابلِ اشاعت" اسکو درخورِ اعتنا نہ سمجھا، حالانکہ "کشف النقاب" وہ کتاب ہے جس کے دلائل و براہین کا مطالعہ فرما کر خود اعلم دوران آیۃ اللہ الخوئی مدظلہٗ العالی نے اس کے پہلے ایڈیشن پر تقریظ تحریر فرمائی ہے۔ بہرحال یہ عکس موسوی صاحب کے پاس اب تک موجود ہے۔

گوکہ میں نے ان کتابوں کی طباعت و اشاعت کا بیڑہ تن تنہا اٹھایا تھا لیکن بعد میں سرکار سید العلماء مدظلہٗ کے بعض پرستاروں اور محبّین نے بھی اس کارِ خیر میں شرکت کا اظہار فرمایا تو میں انکار نہ کر سکا۔

چنانچہ میرے شکرئے کے مستحق ہیں:

الحاج قاضی سید محمد احمد صاحب جنھوں نے سہم امام علیہ السلام میں کر پانچ ہزار روپے کی خطیر رقم مرحمت فرمائی۔

جناب سلامت رضوی جنھوں نے اردو کتاب کی کتابت فرمائی اور ایک پیسہ بھی بطورِ اجرت نہیں لیا۔

جناب میر احمد علی رضوی اور جناب سرفراز حسین چیتر کا جنھوں نے کتاب کی تدوین و طباعت کی ذمہ داری اپنے سر لی۔

جناب ایم ایم غلام حسین اور جناب غلام حسین زیدی کا جنھوں نے اردو کتاب کی تصحیح میں تعاون کیا۔ اور جناب مولانا سید حسن صاحب قبلہ مدظلہٗ کا جنھوں نے ان ہر دو حضرات کی تصحیح کے سلسلے میں مدد فرمائی۔

اب رہا سوال حضرت سید العلماء مدظلہٗ العالی کے شکریہ کا، تو میرے نزدیک یہ جسارت بیجا اور ایک قسم کی خود نمائی ہے۔

یہ بات دوپہر کے سورج کی طرح روشن ہے کہ مذہبِ حقہ اثنا عشریہ پر جو حملے کم از کم اس صدی کے دوران ہوئے ہیں ان کا مسکت اور دنداں شکن دفاع اکثر سید العلماء ہی فرماتے رہے ہیں۔ اس کے لیے میں تو کیا ساری شیعہ قوم سرکار عالی کے زیر بار احسان رہے گی۔ اور جب جب اس قسم کے حملے دنیائے شیعیت پر کیے جائیں گے، آنجناب ہی کے تحقیقات و نگارشات کے ہتھیاروں سے ان کا مقابلہ ہوتا رہے گا۔ اور ان کی کاٹ کی جاتی رہے گی۔

میری دعا ہے کہ خداوندِ عالم بطفیل محمد و آلِ محمد ان کو تندرست و توانا رکھے اور ان کا سایہ ہمارے سروں پر باقی رکھے۔ آمین

فقیرِ درِ اہلِ بیتؑ
جعفر علی اصیل

اَلنَّظَرُ اِلٰی وَجْہِ الْعَالِمِ عِبَادَۃٌ



مقدمۂ ناشر

رَدِّ وہابیہ کے سلسلے میں سرکار رشید العلماء کی یہ معرکہ آرا کتاب جیسا کہ اس کے اصل کتاب کے اصل دیباچے سے ظاہر ہوگا نجف اشرف (عراق) میں لکھی گئی تھی اور وہیں آج سے نصف صدی سے زیادہ پہلے طبع ہوئی تھی۔ اس لیے ظرفِ مکان اور ظرفِ زمان دونوں کی دوری کی وجہ سے اب وہ مثل قلمی کتابوں کے جو غیر مطبوعہ ہوں، کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہوگئی تھی۔ اس لیے ہم نے سرکار مصنف دام ظلہٗ سے استدعا کی کہ وہ اس پر دوبارہ نظرِ ثانی فرما کر اشاعت کے لیے مرحمت فرمادیں اور چونکہ اصل کتاب عربی زبان میں ہے جس سے ہندوستان اور پاکستان کے افراد عمومی طور پر استفادہ نہیں کرسکتے، اس لیے وہ انھیں مناسب اضافوں کے ساتھ اردو میں بھی تحریر فرمادیں چنانچہ ہماری خوش نصیبی سے ہمارے یہ دونوں معروضے پایۂ قبول تک پہونچے اور اب علاوہ عربی کتاب کی دوبارہ اشاعت کے یہ اردو کتاب بھی ہم منظرِ عام پر لانے کی سعادت حاصل کررہے ہیں۔

والسّلام

پیش لفظ از مصنف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ
آلِہِ الطَّاہِرِیْن ہ

نصف کتاب کا پس منظر :-

میرا لکھنؤ میں واقعی بچپن تو نہیں، آغاز جوانی کا دور تھا جس میں آدمی کو ہمارے ہندوستان کے عرف عام میں "بچہ" ہی کہا جاتا ہے۔ جب حجاز میں سعودی سلطنت قائم ہوئی اور وہابی تصورات پوری شدت کے ساتھ منظر عام پر آئے اور ان کے عملی مظاہرات یوں ہوئے کہ پہلے جنت المعلیٰ (مکۂ معظمہ) کے محترم مزارات منہدم کئے گئے اور پھر قاضی القضاۃ نجد ابن بلیہد نے ایک نمائشی استفتا کے ساتھ بظاہر علمائے مدینہ کے فتوے سے جنت البقیع کے مزارات مقدسہ مسمار کرائے۔ جس سے عالم اسلام کے ایک بڑے حصے میں اور دنیائے تشیع میں کلیۃً تلاطم ہو گیا۔ اس لیے کہ یہاں شیعوں کے چار امام حضرت امام حسن علیہ السلام، امام زین العابدین علیہ السلام، امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے روضے بھی تھے۔ اور ان کے علاوہ حضرت سیدۂ نسائے عالمین فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی قبر مطہر بھی تھی۔ اور دوسرے قبور بھی ایسے تھے جن سے دوسرے مسلمانوں کو وابستگی ہے۔

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے وقت سے ایک جماعت نجدی عقائد

For taareekhwar Nauhas:
Visit: www.wirasatali.com

For Hamd, Naat, Soz, Salam,
Marsiya and Majlis Videos

Visit: www.youtube.com/user/mahakavi

(Mirza Jamal)

کی پرستار رہی تھی مگر یہ جماعت مسلمانوں میں گھلی ملی ہوئی تھی۔ اب حجاز کے انقلاب کے بعد اس نے کھل کر ابن سعود کی حمایت شروع کر دی۔ ظفر علی خاں کا مشہور اخبار زمیندار (لاہور) اس جماعت کا خاص آرگن تھا۔ مشائخ صوفیا اور لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل شیعوں کے ساتھ مل کر اس جماعت کے مقابلے میں صف آرا ہوئے۔ چنانچہ فرنگی محل میں انجمن "خُدّامُ الحرمین" قائم ہوئی جس کے سرپرست اس وقت کے سربرآوردہ فرنگی محل کے عالم مولانا قیام الدین محمد عبد الباری صاحب تھے اور آل انڈیا شیعہ کانفرنس لکھنؤ کے زیرِ سایہ انجمن "تحفظ مآثرِ متبرکہ" قائم ہوئی۔

بلا تفرقۂ شیعہ و سنّی رفاہِ عام لکھنؤ میں جلسۂ عام ہوا اور پھر قیصر باغ میں حجاز کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں علاوہ علمائے شیعہ اور علمائے فرنگی محل کے تمام ہندوستان کے اکابر علمار و مشائخ اور کچھ اہم لیڈر مسلمانوں کے شریک ہوئے۔ ان میں جن شخصیتوں کے نام اور صورتیں مجھے یاد ہیں وہ مولانا عبد الماجد بدایونی، شاہ فاخر الٰہ آبادی اور مولانا مظہر الدین ایڈیٹر الامان اور سب سے پیش پیش مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی تھے۔

مسلمان مشہور لیڈروں میں علی برادران شروع میں ابن سعود کے حامی تھے اور اکثر واقعات کو جھٹلاتے رہے تھے۔ لیکن جب انھوں نے خود جا کر حجاز کے حالات دیکھے تو ان کے رویے میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اور حجاز کانفرنس میں وہ بھی شریک ہوئے۔

اس جلسے میں علمائے شیعہ میں سے جناب نجم الملّۃ اور جناب ناصر الملّۃ اور دیگر علمار کے ساتھ علمائے اہلِ سنت میں سے مولانا عبد الباری صاحب وغیرہ کے اتفاق رائے سے التوائے حج کی تحریک پیش ہوئی اور حضرات علمار کے علاوہ فخرِ قوم مولوی سید کلبِ عباس صاحب نے اس کی تائید میں گھن گرج تقریر کی۔ اور جہاں تک یاد ہے مظہر الدین صاحب ایڈیٹر الامان نے بھی تائید کی۔ مگر علی برادران مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر نے

اس تجویز کی مخالفت کی اور مولانا محمد علی نے اپنی سیاسی سوجھ بوجھ ظاہر کرتے ہوئے، یہ مصرع پڑھا:

"عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں"

اُن کی تقریر ختم ہوتے ہی شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی کھڑے ہوئے اور انھوں نے ان کی رد کرتے ہوئے کہا کہ صرف سیاسی سوجھ بوجھ کوئی چیز نہیں اس کے ساتھ دینی بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔ میں اس مصرع کو اکیلا نہیں پڑھوں گا۔ مجھے حق ہے کہ میں اس کا دوسرا مصرع پڑھوں:

"پانچویں پشت ہے شبیر کی مدّاحی میں"

چنانچہ تجویز کثرت رائے سے منظور ہوئی۔

چوں کہ دیگر علمار کے ساتھ اس جہاد میں ہمارے والد بزرگوار جناب ممتاز العلماء سید ابو الحسن عرف منّن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ بڑے جوش و خروش کے ساتھ شریک تھے، اس لیے میں جس کے عنفوانِ شباب کے ساتھ جولانئ قلم کا ابتدائی دور تھا اپنے قلم کو لیے اس میدان میں اتر پڑا جس میں پہلی مرتبہ بلا تفریق شیعہ و سنّی عالمِ اسلام سے متعارف ہوا۔ اس ذیل میں چوں کہ سب سے اہم مسئلہ "عمارتِ قبور" کا تھا اس لیے اخبار "زمیندار" کے ایک مضمون کی رد میں "البَیت المعمُور فی عِمارۃ القبُور" کتاب لکھی جو اس وقت کے ممتاز شیعی مطبع "نور المطابع" میں شائع ہوئی۔ اور بکثرت اسلامی جرائد میں اس پر تبصرے شائع ہوئے اور دور دور سے اس کی مانگ آئی اور یہ کتاب بہت کم عرصے کے اندر اطرافِ ملک میں منتشر ہو گئی۔ پھر اخباروں میں بکثرت مضامین کے علاوہ التوائے حج کے مسئلے پر شیعہ اور سنّی دونوں کے نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے ایک بسیط مضمون لکھا جسے ادارہ "خُدّامُ الحرمین" نے کچھ دوسرے حضرات کے مضامین کے ساتھ شائع کیا۔ جناب نجم الملّۃ اعلی اللہ

اللہ مقامہٗ کے پاس عراق وشام وغیرہ کے علمار کے جو منشور اس موضوع پر آئے تھے، اُن کے حکم سے ان کا اُردو ترجمہ اور اپنی طرف سے عالم اسلام کے نام ایک عربی اپیل ترجمے کے ساتھ شامل کرکے "فریادِ مسلمانانِ عالم" کے نام سے ایک کالم میں عربی اور دوسرے پہلو کے کالم میں اُردو، اس طرح ایک مجموعہ مرتب کیا جسے انجمن "مؤید العلوم" مدرسۃ الواعظین لکھنؤ نے شائع کیا۔

[اصل عربی کتاب کی تصنیف اور اسکی کیفیت]

اب میں نے اس موضوع پر عربی میں ایک مکمل کتاب لکھنے کا ارادہ کیا جس میں وہابیت کی تاریخ اور نجدیوں کے تمام عقائد پر سیر حاصل تبصرہ ہو۔ اس کے لیے ماخذوں کی تلاش میں مختلف کتب خانوں کی سیر کرنا پڑی۔ اور کافی مواد مکمل حوالوں کے ساتھ فراہم ہوگیا۔ لیکن ابھی اس کی ترتیب کے ساتھ جمع آوری اور کتاب کی تحریر کا کام شروع نہیں ہوا تھا کہ شعبان ۱۳۴۵ھ میں تکمیل علم کے لیے میرا عراق کا سفر ہوگیا اتفاق سے اسی دن سیّد الفقہاء جناب مولانا مفتی سید احمد علی صاحب قبلہ مع متعلقین زیارت عتبات عالیات کے لیے روانہ ہوئے اور ریل اور جہاز دونوں میں ان کا ساتھ رہا۔ کربلائے معلیٰ میں حرم حسینی کے قریب ایک مکان تاج محل مرحومہ کا تھا، جس میں اکثر ہندوستانی زائرین ٹھہرتے تھے۔ یہاں قیام ہوا۔

فطری طور پر جو شخص زیارت کے لیے جاتا ہے، وہ اگرچہ نجف اشرف۔ کاظمین۔ سامرا تمام مشاہد مشرفہ کی زیارت کو جائے گا مگر روانگی کے وقت جب پوچھا جائے کہاں جا رہے ہو؟ تو کہے گا "کربلائے معلیٰ" اور جو شخص تحصیل علم کے لیے جا رہا ہو، وہ بھی اگرچہ ان تمام مشاہد مشرفہ کی زیارت کرے گا مگر اس سے جب پوچھا جائے کہاں جاتے ہو؟ تو کہے گا "نجف اشرف"۔ چنانچہ جناب مفتی صاحب قبلہ چونکہ زیارات کے لیے گئے تھے تو کربلا پہونچ کر ان کا احساس یہ تھا کہ منزل مقصد پر پہونچ گئے۔ لہٰذا وہ کچھ مدت کے لیے وہاں رہ گئے اور میں دو چار دن وہاں بسر کر کے نجف اشرف

چلا گیا۔ اور چند دن خادم کے یہاں قیام کرکے مدرسۂ ہندی میں جو لاہور کے خاندان قزلباش کا بنوایا ہوا تھا، اس لیے "مدرسۂ نواب" کہلاتا تھا، مقیم ہوگیا۔ عراق و ایران میں مدرسے کے معنی ہوتے ہیں بورڈنگ ہاؤس یعنی طلبہ کے لیے دار الاقامہ۔ ورنہ درس تو مسجدوں میں یا علمار کے مکانات پر ہوتے ہیں۔

اب پہونچ تو گئے مگر تدریس کا کام ابھی شروع نہ ہو سکتا تھا کیوں کہ ماہ رمضان کے قرب کی وجہ سے درس بند ہو چکے تھے۔ اور ۹ر شوال تک تعطیل تھی لہٰذا ہم نے اس درمیانی مدت کو بامصرف بنانے کے لیے یہ کام ہاتھ میں لیا کہ ردّ وہابیہ کا وہ مواد جو ہندوستان میں جمع کیا تھا، اُسے کتابی شکل میں عربی میں لکھنا شروع کر دیا اس التزام کے ساتھ کہ دس صفحے روز مسودے کے لکھے جائیں۔ چنانچہ دس دن میں سو صفحات کی کتاب کا مسودہ تیار ہوا اور اسی التزام کے ساتھ دس دن میں اُسے صاف کیا۔

نجف اشرف میں ایک جلیل القدر صاحب علم و اطلاع، علاوہ علوم دینیہ کے عربی کے بلند پایہ ادیب و شاعر اور غیرت دینی و احساس اسلامی رکھنے والے علامہ میرزا محمد علی اوردبادی تھے اور وہ بغیر ذرّہ بھر ملکی و قومی تعصب کے خالص علمی اور دینی اقدار کے زبردست قدرداں تھے۔ انھیں نہ معلوم کیونکر میرا حال معلوم ہوگیا اور وہ پوچھتے ہوئے اسی ابتدائی دور میں مدرسے کے حجرے میں میرے پاس پہونچ گئے۔ اور ایک دم انھیں مجھ سے ایسی محبت پیدا ہوئی جس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اور بعد میں ہماری اس "یک جان و دو قالب" والے اتحاد میں علامہ سیّد محمد صادق بحر العلوم شریک ہوگئے تو ہم (بلا تشبیہ) "اقانیم ثلثہ" ایسے ہوگئے کہ میرے پورے زمانۂ قیام نجف میں ہمارا اتحاد مثالی حیثیت اختیار کر گیا۔ بعد میں جب ہم لوگ جسمانی طور پر متفرق ہوگئے، تب بھی قلبی ارتباط ہم لوگوں کا غائبانہ طور پر برقرار رہا۔

بہر حال پہلی ملاقات کے بعد تقریباً ہر روز علامہ اوردبادی آنے لگے اور جتنا جتنا

یہ کام ہوتا گیا، وہ اس پر مطلع ہوتے رہے اور انھوں نے نجف اشرف کے علمی حلقے میں اُس کا چرچا شروع کردیا۔ اس طرح تصنیف مکمل ہونے کے پہلے ایک معنی میں نجفِ اشرف میں اس کتاب کی اشاعت ہوگئی۔ اور اب ہم شب قدر کی مخصوصی میں زیارتِ کربلائے معلیٰ کے لیے گئے تو یہ کتاب صاف شدہ شکل میں ساتھ موجود تھی۔

چوں کہ جناب مفتی صاحب مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے، اس لیے میں اس دفعہ بھی اُنہی کے پاس تاج محل میں جاکر ٹھہرا اور ان کے پاس قدیمی تعلقات کی بنا پر کربلائے معلیٰ کے علماء و افاضل تشریف لایا کرتے تھے۔ اب میں موجود تھا تو ہر محفل میں حاضر رہتا تھا اور جنابِ مفتی صاحب تعارف میں میری اس تصنیف کا ذکر فرماتے تھے۔

چوں کہ وہابی مظالم اور وہابی نظریات کا چرچا ہر جگہ شدت کے ساتھ تھا، اس لیے متعدد حضرات ردِّ وہابیہ میں کتابیں لکھ رہے تھے اور میرے سن و سال کو دیکھ کر اس کتاب کا ذکر سنتے ہوئے متعجبانہ طور پر اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرماتے تھے۔ اب میں ہر ایک کو یہ تحریر دیکھنے کے لیے کہاں دیتا، پڑھ کر سنانے لگتا تھا جس سے انھیں مزید مندرجات کتاب کے سننے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ یوں چند دن مغربین کے بعد کافی رات تک میرا ایک مستقل مشغلہ کتاب خوانی کا ہوگیا۔ اور روزانہ حضرات کے ساتھ کچھ نئے افراد جن تک یہ تذکرہ پہونچتا تھا، مشتاق ہوکر تشریف لاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ وہاں کے لحاظ سے میں اس وقت ابتدائی درجے کا طالب علم تھا اور یہ حضرات وہاں کے طلبہ نہیں بلکہ علما رکی حیثیت رکھتے تھے مگر ان کی وسعت قلب تھی کہ ہر ایک نے اس موضوع پر اس کتاب کو ایک نادر چیز سمجھا۔ یہاں تک کہ آقا شیخ محمد علی قمی جو اس وقت اکابر علمار کربلائے معلیٰ میں تھے، ساٹھ سال سے بظاہر عمر متجاوز تھی اور کفایہ پر ان کا حاشیہ دو جلدوں میں نجف اشرف میں طبع ہوا بعد میں جب میں عراق ہی میں تھا تو وہ ایران تشریف لے گئے تو آیۃ اللہ العظمیٰ حاج شیخ عبدالکریم یزدی حائری کے بعد

قم میں صفِ اوّل کے علمار میں ان کا شمار ہوا۔ وہ بھی چوں کہ ردّ وہابیہ میں ایک رسالہ تحریر فرمارہے تھے تو اس کتاب کا ذکر سن کر وہ تشریف لائے۔ اور خواہش فرمائی کہ وہ دو تین دن کے لیے اسے ساتھ لے جائیں۔ میں نے ان کی جلالت اور بزرگی سے متاثر ہوکر اس کتاب کا انھیں دے دینا گوارا کرلیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے اور حسب وعدہ تین دن بعد تشریف لاکر اُسے واپس کردیا چنانچہ اس کے بعد ممدوح کا رسالہ اس موضوع پر شائع ہوا اور دوسری کتاب علامہ شیخ محمد علی سنقری کی جس کا نام تھا "المشاهد المشرفة والوهابيون" تیسری کتاب تحفۃ الاسلام آقا سید حسن قزوینی کی نکلی۔

ہمارے مورث اعلیٰ حضرت غفران مآب طاب ثراہ کے استاد صاحب ریاض کی اولاد میں آقا سید محمد علی طباطبائی ایک بڑے غیرت دینی رکھنے والے حساس بزرگ تھے جو سرکار آقا میرزا محمد تقی شیرازی اور آقائے شریعت وغیرہ کی سرکردگی میں پہلی جنگ عظیم کے بعد (پہلی طباعت) انگریزوں کے تسلط سے عراق کو آزاد رکھنے کے جہاد میں شریک رہ چکے تھے، انھیں میری کتاب سے انتہائی گرویدگی پیدا ہوگئی اور میں چند روز کے بعد نجف اشرف واپس ہوا تو علامہ اوردبادی نے اپنے حلقۂ احباب میں نجف اشرف کے اندر اور آقا سید محمد علی طباطبائی نے کربلائے معلیٰ میں یہ تحریک چلائی کہ اس کتاب کو چھپنا چاہیے۔ چنانچہ مطبع حیدریہ نجف اشرف میں یہ کتاب طبع ہوئی۔

اس زمانے میں خود میری ذہنیت روا دارانہ نہ تھی۔ اس لیے کتاب کا نام رکھا تھا:

"سوط عذاب علی اتباع ابن عبدالوهاب"

جو مجھے بہت پسند تھا مگر طباعت کے وقت ان حضرات نے کہا کہ یہ نام سخت ہے اور بدلوا کر "كشف النقاب عن عقائد ابن عبدالوهاب" نام رکھنے پر مجبور کیا جس کا اس وقت بہت دکھ ہوا۔ پھر آخر کتاب میں ایک اختتامی تبصرہ تھا، وہ ان لوگوں نے نکلوا دیا کہ اس کا لب و لہجہ بہت سخت ہے۔ اس ملک کی فضا اس کی

متحمل نہیں ہے۔ مجبوراً وہ بھی نکال دیا اور صرف چند سطروں کا اضافہ کرکے ختم کردیا جس کا مزید صدمہ ہوا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ میری ذہنیت خود روادارانہ ہوگئی جس کی ہندوستان میں سزا بہت بھگتنا پڑی۔

اس کتاب کے مسودے کے ابتدائی صفحے پر میرے اس وقت کے ابتدائی استاد عصر حاضر کے مرجع تقلید آیۃ اللہ الحاج سید ابوالقاسم خوئی دام ظلہ نے جو اس وقت درس سطحی کے مدرس تھے چند سطریں بھی بطور تقریظ لکھی تھیں۔ پھر چھپنے کے بعد کتاب اطراف و اکناف میں منتشر ہوگئی تو ہندوستان کے بزرگ مرتبہ عالم مولانا سید ظہور حسین صاحب قبلہ نے ایک عربی تقریظ لکھ کر بھیجی اور اہل سنت کے بزرگ عالم اور شیخ طریقت مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے نظم اور نثر عربی میں تقریظیں بھیجیں اور زبانی ایسے الفاظ فرمائے جو والد علام ممتاز العلماء طاب ثراہ نے اپنے اجازہ میں جو میرے لیے چند سال کے بعد لکھا تھا درج فرمائے۔

شام کے بزرگ مرتبہ عالم جناب سید محسن امین عاملی طاب ثراہ نے جو مشہور بڑی کتاب "اعیان الشیعہ" کے مصنف تھے دو سال بعد ایک ضخیم کتاب اس موضوع پر "کشف الارتیاب" تحریر فرمائی تو میری اس کتاب کے دو صفحے اس طرح اخذ فرمائے جس میں قہری طور پر ایک بڑے مسامحے کی صورت پیدا ہوگئی اور وہ یہ کہ میں نے "تاریخ نجد" ابن الآلوسی سے وہابی تحریک کے ابتدائی نشوونما کے حالات لکھے ہیں تو فٹ نوٹ میں لکھ دیا ہے کہ نقلناها بمعناها من تضاعیف تاریخ نجد لابن الالوسی، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عبارت تاریخ نجد میں کسی جگہ نہیں ہے۔ موصوف نے اس نوٹ اور اس کے مفہوم پر توجہ نہیں فرمائی، اور اس عبارت کو تاریخ نجد ابن الآلوسی کے حوالے سے درج فرما دیا۔ حالانکہ وہ عبارت

میری ہے، ابن الآلوسی کی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی تلاش کرے تو تاریخ نجد میں کسی جگہ بھی وہ عبارت نہیں مل سکتی۔ جب یہ کتاب میری نظر سے گزری تو میں نے ایک خط کے ذریعے ممدوح کو اس مسامحے کی طرف توجہ دلائی۔ ممکن ہے نظر ثانی میں موصوف اس کی اصلاح فرما دیتے مگر جہاں تک مجھے علم ہے، وہ کتاب دوبارہ طبع نہیں ہوئی۔

دوبارہ اشاعت اور اردو ترجمہ کا پس منظر

میری کتاب "کشف النقاب" چونکہ علامہ اوردبادی کے اہتمام سے چھپی تھی تو اس کا مرکز طباعت کے بعد ان کا مکان ہی رہا۔ وہیں سے فروخت ہوئی اور جو حضرات علماء ایران وغیرہ سے آتے تھے، انھیں تحفۃً بھی دی دیتے تھے۔ ہندوستان میں صرف چند کاپیاں آئی تھیں جو میں نے کچھ علمائے اعلام کو تحفۃً بھیجی تھیں۔ میرے پاس صرف ایک کاپی تھی جو لکھنؤ کے فرقہ وارانہ فساد کے ذیل میں جو چند سال قبل چہلم (۲۰ صفر) کے دن ہوا تھا، میرے مکان اور کتب خانے کی آتش زدگی میں نیست و نابود ہوگئی۔

اب حبیب محترم جناب جعفر علی اصیل صاحب (بمبئی) نے جو اس کی دوبارہ طباعت کا خیال ظاہر کیا اور اردو میں بھی اس کی اشاعت کے لیے کہا تو میرے لیے اس کی تعمیل ممکن نہ تھی مگر موصوف نے خود بمبئی میں تلاش کرکے ایک کاپی دستیاب کی اور اس کا عکس میرے پاس بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد مجھ پر حجت تمام ہوگئی جس کے بعد اگر میں پہلوتہی کروں تو اس امر خیر کے انجام پانے میں میری تقصیر سد راہ قرار پائے۔ لہٰذا باوجود شدید موانع اور مصروفیتوں کے کافی تاخیر کے ساتھ سہی، میں اس مقصد کے لیے "تنم بانگشت" ہوگیا اور اب اتنے عرصے میں خود ہندوستان میں اس موضوع پر

خلاصۂ دیباچۂ عربی کشف النقاب



بعد حمد خالق متعال و صلوٰۃ و سلام بر محمد و آل۔

یہ کتاب "کشف النقاب عن عقائد ابن عبد الوہاب" علی نقی النقوی کے قلم سے معرضِ ظہور میں آرہی ہے اس وقت جب توفیق الٰہی نے سرزمین نجف اشرف پر پہونچنے کی سعادت عطا فرمائی ہے اور بس سامان سفر منزل قیام پر اتارنے کے بعد جو عرصے سے میرے ذہن میں خیال تھا کہ ایک کتاب ایسی تحریر ہو جس میں وہابی جماعت کے عقائد کا ذرا تفصیل کے ساتھ بیان ہو، اس لیے کہ بہت سے افراد اس فرقے کے عقائد سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں چنانچہ بہت کم دنوں میں اس کی تکمیل ہوگئی۔ اور اس کتاب کو میں نے ایک مقدمے اور چند ابواب پر تقسیم کیا ہے :-

مقدمہ : تاریخ ابن عبد الوہاب اور ان کی نشو و نما اور ترقی کی کیفیت۔

پہلا باب : اُن کا عقیدہ حضرت اقدس الٰہی کے باب میں۔

دوسرا باب : اُن کا عقیدہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں۔

جو مزید مواد فراہم شدہ میرے پاس موجود تھا، اس میں کچھ جو عربی کے لیے موزوں تھا اس کا اصل عربی کتاب میں بھی اضافہ کر دیا اور جو ہندوستان ہی کے لیے موزوں ہے، اُسے اس اردو کتاب میں شامل کر رہا ہوں کیوں کہ اُن شخصیتوں سے جن کے تراوشات قلمی سے کام لیا گیا ہے، ہندوستان ہی کے اسلامی حلقے ہی متعارف ہیں۔ نیز جو مقدمہ لکھا جا رہا ہے، اس کے بھی کچھ مضامین مسلمانانِ ہند سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اُن کو بھی عربی میں شامل نہیں کیا گیا۔ اس طرح میرا اندازہ یہ ہے کہ اردو کتاب کا حجم عربی والی کتاب سے کچھ زیادہ ہوگا۔ اس لیے مجموعی طور پر اُسے عربی کتاب "کشف النقاب" کا ترجمہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کے پورے ترجمے پر مشتمل اردو میں اسے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت حاصل ہے۔ والسلام

علی نقی النقوی

۱۰ ذیقعد سنہ ۱۳۴۰ھ (علیگڈھ)

تیسرا باب: اُن کا عقیدہ اولیاء و صالحین کے بارے میں۔
چوتھا باب: اُن کا عقیدہ تمام روئے زمین کے مسلمانوں کے بارے میں۔
پانچواں باب: اُن کا عقیدہ انبیاء و صالحین کے مزارات اور قبروں کے بارے میں۔
چھٹا باب: اُن احادیث و اخبار میں جو اہلِ نجد کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وارد ہوئے ہیں۔
ساتواں باب: وہابی جماعت کی عملی سرگرمیاں اس کے نمایاں ہونے کے وقت سے زمانۂ حال تک۔

نوٹ:

اس اردو کتاب میں مذکورہ عناوین سے پہلے دو عنوانوں کا جنھیں اس اردو کتاب کا مقدمہ سمجھنا چاہیئے شروع میں اضافہ کیا جا رہا ہے:۔

(۱) مسلمانوں میں عموماً اور شیعوں میں خصوصاً ہندوستان و پاکستان کے اندر لفظ وھابی کی اصطلاح۔

(۲) ہندوستان میں وہابیت کا فروغ اور اس کی مختلف شکلیں۔

مسلمانوں میں عموماً اور شیعوں میں خصوصاً

ہمارے یہاں کی اصطلاح

اصل "وہابی" تو ابن عبدالوہاب کا پیرو، وہی حجاز کا برسرِاقتدار گروہ ہے جو نجد کا باشندہ ہے اور اس لیے اُن کا پایۂ تخت اب بھی نجد کے علاقے میں شہر ریاض ہے۔ یہ فقہ کے لحاظ سے حنبلی ہیں یعنی امام احمد بن حنبل کی فقہ کے پیرو ہیں اور اصول عقائد میں ان کے پیش رو ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیّم اور ابن عبدالہاد وغیرہ ہیں۔

انہی ابن تیمیہ وغیرہ کے تصورات کو محمد بن عبدالوہاب نے اپنا کر چونکہ بارھویں صدی کے اواخر اور تیرھویں صدی کے آغاز میں علاقۂ نجد کے ایک حصے کے اُس وقت کے سعودی خاندان کے راس و رئیس محمد بن سعود کی مدد سے پھیلایا جس کی تاریخ اس کتاب کے عربی مقدمے کے ترجمے میں بیان ہوگی۔ اس لیے اگرچہ اُن کے باپ عبدالوہاب اس مسلک میں ان کے ساتھ متحد نہ تھے بلکہ آخر میں باپ بیٹے کی مخالفت بہت نمایاں ہو گئی تھی مگر وہ مسلک بیٹے کے نام پر نہیں بلکہ بیچارے باپ کے نام پر جو اس کے خلاف تھے منسوب ہو کر "وھابی" کہلایا۔

پھر چونکہ ان کی تعلیم کا اہم جزء درگاہوں اور روضوں پر حاضری کی مخالفت اور اولیاء و مقربین بارگاہِ الٰہی اور بالخصوص رسولؐ و آلِ رسولؐ سے توسل کو شرک قرار دینا اور نذر و نیاز اور فاتحے وغیرہ سے ممانعت تھی لہٰذا ہندوستان اور پاکستان کے اندر اہلِ سنت میں یہ اصطلاح ہو گئی کہ بریلوی حضرات جو ان باتوں کے قائل ہیں، وہ اپنے کو

"سُنّی" کہتے ہیں اور دیوبندی حضرات کو جو اکثر ان چیزوں کے مُنکر ہیں "وہابی" کہتے ہیں چنانچہ کچھ بریلوی مقرّرین اور بعض صاحب قلم بھی جب دیوبندی حضرات کا ذکر کرتے ہیں تو مثلاً یوں کہتے ہیں کہ مولوی نمبر ۲۴ نے یوں کہا۔ چونکہ "وہابی" کے عدد چوبیس ہیں۔

ہندوستان کے شیعوں کا یہ محاورہ ہو گیا ہے کہ وہ اہل سنت کے اس طبقے کو جو ان باتوں کا قائل ہے اور اکثر شیعوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کرتے ہیں یا عزاداری وغیرہ میں شریک ہوتے ہیں حنفی کہتے ہیں اور ان امور کے منکرین اور بالخصوص عزاداری امام حسین علیہ السلام کے مخالف افراد کو وھابی کہتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دیوبندی حضرات مسلک فقہی کے لحاظ سے حنفی ہیں۔ وہابیوں کے ہم مسلک یعنی حنبلی نہیں ہیں اور شیعوں کی اصطلاح میں "وہابی" سنیوں کی جو سب سے بڑی مثال ہو سکتی ہے۔ مثلاً مولوی عبدالشکور صاحب اپنے وقت کے مدیر النجم' وہ بھی مسلکاً حنفی تھے وہابیوں کی طرح حنبلی نہیں تھے۔

ہماری اس کتاب کا نام ہو "ردِّ وہابیہ" ہے' اس میں ہمارا نصب العین اُس خاص گروہ کی رد ہے جو ابن عبدالوہاب کا پیرو ہے لیکن بحیثیت موضوع جبکہ توسل وغیرہ مباحث پر فیصلہ کن بحث کی جائے گی تو جو اُن لوگوں کے ان تصوّرات میں ہم مسلک ہوں سب کی رد ہو جائے گی۔ چاہے وہ کسی بھی معنی میں "وہابی" قرار پاتے ہوں یا نہیں۔

ہندوستان میں وہابیت کی درآمد اور اُس کا ارتقاء

جہاں تک ہمیں معلوم ہے ہندوستان میں وہابی تصوّرات کی درآمد جناب شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ذریعے سے ہوئی۔ وہ چاہے خود کلیتہً ان عقائد کے علم بردار نہ ہوں جس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ وہ خود تصوّف کے قائل ہیں بلکہ اُن کا مشائخ صوفیا میں شمار ہے اور ان کے صاحبزادگان جناب شاہ عبدالعزیز دہلوی مصنّف تحفۂ اثنا عشریہ وغیرہ اس باب میں نمایاں نہیں ہوئے مگر ان کے بعد شاہ اسماعیل جن کے نام کے ساتھ عموماً "شہید" کی لفظ استعمال ہوتی ہے' اس مسلک کے بڑے علمبردار بن گئے اور اس جماعت کے سرگروہ سیّد احمد ہوئے کہ اُن کے نام کا بھی تقریباً جزو لفظ "شہید" ہے۔

علمائے دیوبند اگرچہ جیسا کہ پہلے آچکا حنفی ہیں اور غالباً تصوف کے بھی قائل ہیں اور اس کے سلسلوں میں منسلک ہیں مگر ان کے علمی حیثیت سے مورثِ اعلیٰ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے یہاں اس قسم کے تصورات اتنی شدت کے ساتھ ہیں کہ اُن کے الفاظ سے شانِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں گستاخی کے پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ لوگ بالکل وہابی ہوں یا نہیں' مگر ان سے وہابیت کو تقویت ضرور ہوئی۔

بعض افراد جن میں مولانا ابوالکلام آزاد پیش پیش ہیں جو یقیناً وہابی مسلک کے پیرو نہیں تھے اور نہ تنگ نظری و عصبیت کا شکار تھے' یہاں تک کہ امتیازی نظریہ "تبرا" کی حمایت میں "تولاّ و تبرا" ہی کی سرخی سے وہ ایک ایسے مضمون کے خالق ہیں جسے امامیہ مشن لکھنؤ نے کتاب "خلافت و امامت" کے کسی حصّے کا جزو بنا کر شائع کیا تھا۔ اس مضمون میں خصوصیت کے ساتھ چند الفاظ تو اتنے معنی خیز اور دل آویز ہیں کہ حفظ کرنے کے قابل ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ:

"اگر ہم یہ اصول بنا لیں کہ بُروں کو بھی اچھا کہیں گے تو جو واقعی

اچھے ہیں اُن کے لیے ہمارے پاس کیا رہ جائے گا۔"؟

مگر علمی طور پر وہ شیخ ابن تیمیہ کے ایسے مدّاح ہیں کہ جیسے وہ اُن کی جلالتِ علمی سے انتہائی مرعوب و متاثر ہیں۔ اُن کے بعد سے جیسے سوادِ اعظم کے سابق تلم افراد کی وضع بن گئی ہے کہ وہ ابن تیمیہ کی تعریف ضرور کریں جو بظاہر تقلیدی حیثیت رکھتی ہے یعنی ان لوگوں نے جناب ابن تیمیہ کے تصانیف کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ بہرحال اس سے بھی بالواسطہ وہابی خیالات کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور اب سعودی حکومت اگرچہ بین الاقوامی دباؤ سے مذہبی طور پر بہت حد تک "تقیّہ" میں ہے اور یہ تقیہ "شروع ہی سے" قبۂ نبوی" کی بقا میں تو رہا ہی ہے جو کہ اُن کے نقطۂ نظر سے (معاذ اللہ) "صنمِ اکبر" ہونے کی وجہ سے زیادہ مستحقِ انہدام تھا" اس کے علاوہ وہ مسلمانانِ عالم یہاں تک کہ ہم شیعوں کو حج سے نہیں روکتے بلکہ بہت حد تک سہولتیں فراہم کرتے ہیں جبکہ اُن کے مذہب کی رُو سے ان سب کا مشرکین میں داخل ہونے کی بنا پر مسجدِ حرام کے قریب جانا ناجائز ہے مگر ان باتوں میں بظاہر تشدد کے کم ہونے کے باوجود" اب ان کی دولت جو تیل کی بدولت انتہائی افراط سے حاصل ہو گئی ہے" ممالکِ اسلامیہ میں وہابیت کی تبلیغ پر شدت کے ساتھ صرف ہو رہی ہے جس سے ذہنی طور پر شیعوں کو تو بس اذیت ہو سکتی ہے مگر ان کا اثر معتقدات کے لحاظ سے اہلِ سنت کی اکثریت پر پڑنا ناگزیر ہے۔

مقدّمہ

ابن عبدالوہاب کی تاریخ زندگی اور نشو و نما کی کیفیت[1]

ابن عبدالوہاب کا نام و نسب محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان تمیمی ہے۔ اُن کی نشو و نما علاقۂ نجد کے شہر عینیہ میں ہوئی اور انھوں نے حنبلی فقہ اپنے والد سے پڑھی اور زمانۂ صغر سنی ہی سے وہ ملتِ اسلامیہ کے عام رجحان کے خلاف باتیں کہنے لگے اور بہت سی باتوں پر جو مسلمانوں میں رائج تھیں اعتراض کرنے لگے۔ مگر عرصے تک انھیں کوئی ہم نوا نہیں ملا۔ اس کے بعد انھوں نے مکۂ معظمہ کا سفر کیا اور پھر مدینۂ منورہ گئے اور شیخ عبداللہ بن ابراہیم بن سیف کے شاگرد ہوئے اور وہاں انھوں نے روضۂ رسولؐ پر دعائیں کرنے پر شدت سے برہمی کا اظہار کیا۔ پھر نجد گئے اور وہاں سے شام کے ارادے سے بصرہ گئے اور یہاں شیخ محمد مجموعی سے درس لیا اور اب بصرہ کے مسلمانوں کی باتوں پر اعتراض کرنے لگے تو وہاں کے مسلمان برافروختہ ہو گئے یہاں تک کہ انھیں بصورتِ فرار وہاں سے نکلنا پڑا۔ بالآخر وہ نجد کے شہر حریملہ میں پہونچے جہاں ان کے والد کا قیام تھا۔ اور عرصے تک ان سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مگر یہاں انھوں نے اہلِ نجد کے اکثر افعال و اعمال پر "شرک" ۔ "شرک" کی آوازیں بلند کیں اور اُن کے والد نے ان کو اس سے منع کیا تو وہ اُن کی بات بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے بلکہ ان سے برسرِ جنگ ہو گئے اور کچھ لوگ ان کی پارٹی میں شامل ہو گئے جس سے ان میں اور اہلِ حریملہ میں جنگ و جدال کی نوبت آ گئی۔

---

[1] ان مضامین کو ابن آلوسی بغدادی کی کتاب "تاریخ نجد" کے مختلف مقامات سے اخذ کر کے ہم نے اپنی عبارت میں درج کیا ہے۔

اب اُن کے والد شیخ عبدالوہاب کا ۱۱۵۳ھ میں انتقال ہوگیا تو انھوں نے اور زیادہ شدت کے ساتھ اپنے عقائد کا اعلان شروع کیا جس کے بعد اہل حرملہ اُن کے قتل پر تیار ہوگئے تو وہاں سے عیینہ کی طرف منتقل ہوگئے۔ یہاں کا حاکم اُس زمانے میں عثمان بن محمد بن معمر تھا جسے ابن عبدالوہاب نے وہ سبز باغ دکھایا کہ وہ اگر ان کا ساتھ دے تو تمام نجد کا حکمراں ہو جائے گا۔ اس نے ان کی مدد کا بیڑا اٹھایا اور اب اس مادی طاقت کا سہارا لے کر انھوں نے زور و شور کے ساتھ اپنی تبلیغ جاری کردی اور جب عیینہ کے کافی آدمی اُن کے ساتھ ہوگئے تو انھوں نے زید بن خطاب کے مزار کا قبہ جو اس نواح میں تھا منہدم کرا دیا مگر یہ خبر احساء اور قطیف کے حکمراں سلیمان بن محمد بن عزیز حمیدی کو پہونچی تو انھوں نے بڑا سخت ناراضگی کا خط عیینہ کے حاکم عثمان کے پاس بھیجا کہ اس شخص کو قتل کرا دو۔ عثمان کو ابن عبدالوہاب سے گرویدگی تو تھی مگر سلیمان والی احساء کے مخالفت کی تاب نہ تھی، اس لیے اس نے خفیہ طریقے پر ابن عبدالوہاب کے پاس پیغام بھجوایا کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے۔ انھوں نے اُسے بہت پامردی کی دعوت دی اور پورے نجد کا حکمراں بننے کی امیدیں دلائیں مگر وہ ان کے کہنے میں نہیں آئے اور سختی کے ساتھ فوراً چلے جانے کی تاکید کی۔ مجبوراً ۱۱۶۰ھ میں وہ وہاں سے نکل کر درعیہ پہونچے۔ یہ سرزمین ہمیشہ سے شیطانی تحریکوں کا مرکز بنی رہی تھی۔ یہ وہی یمامہ کی سرزمین ہے جہاں سے مسیلمہ کذاب اٹھا تھا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ یہاں کا حکمراں موجودہ سعودی حکومت کا مورثِ اعلیٰ قبیلۂ عنیزہ میں سے محمد بن سعود تھا۔

ابن عبدالوہاب نے کسی ذریعے سے اُس کی بیوی سے رابطہ قائم کیا اور اُسے تمام نجد کی حکمرانی کا خواب دکھایا۔ یہ محمد بن سعود ان کی باتوں میں آگیا اور تن من دھن سے اُن کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوگیا۔ اور مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر بنام "جہاد" ان کے جان و مال اور عزت کے اتلاف کے لیے ابن عبدالوہاب کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔

محمد بن سعود سے عہد و پیمان کی تکمیل کے بعد محمد بن عبدالوہاب شہر کے اندر داخل ہوئے اور ابن سعود نے ایک بہت بڑا لشکر مرتب کرکے اطراف و جوانب کے مزارات کو منہدم کرنے اور جو مسلمان سدِّ راہ ہوں اُن کا خون بہانے کے لیے بھیج دیا جنھوں نے پورے طور پر اس حکم کی تعمیل کی اور قتل و غارت کا بازار شدت کے ساتھ گرم کر دیا۔

جب یہاں پوری کامیابی حاصل ہوگئی تو اطراف و جوانب کے حکام کے پاس اطاعت و انقیاد کے لیے خطوط لکھے جن میں سے بعض نے مرعوب ہوکر باسانی اطاعت قبول کرلی اور جنھوں نے توجہ نہیں کی، درعیہ کے لوگوں کو اُن سے جنگ کرنے پر مامور کیا گیا۔ چنانچہ اطراف نجد اور اس کے آگے بڑھ کر احساء میں خونریز معرکے ہوئے جن کے بعد پورے نجد اور اُس کے تمام قبیلوں پر قہر و غلبہ کے ساتھ آلِ سعود کی حکمرانی ہوگئی۔ یہاں تک کہ ۱۲۰۶ھ میں محمد بن عبدالوہاب نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کی مگر حکومت آلِ سعود نسل در نسل اُس مسلک کی اشاعت میں عسکری طاقت کے ساتھ مصروف رہی۔

چنانچہ محمد بن سعود کے بعد اُس کا بیٹا عبدالعزیز ہوا۔ یہ بھی اطراف و جوانب میں فوجیں بھیجتا رہا اور عبدالعزیز کے بعد سعود ہوا۔ یہ اپنے باپ سے زیادہ سخت تھا۔ اُس نے مسلمانوں کو حج سے روک دیا اور سلطان ٹرکی کے خلاف خروج کیا۔ مگر اس کے بعد سرگرمیاں زیادہ تر علاقہ نجد میں محدود تھیں۔ یہاں تک کہ جب جنگ عظیم میں حکومت ٹرکی جرمنی کا ساتھ دینے کی وجہ سے انگریزوں کے غیظ و غضب کا شکار بنی اور جرمنی کی شکست سے کمزور بھی ہوگئی تو پہلے انگریزوں نے شریفِ مکہ سے حکومتِ ٹرکی کے خلاف خودمختاری کا علم بلند کرایا۔ پھر شریفِ مکہ سے ناراض ہوکر اُس وقت کے سعودی حکمراں سے جس کا نام بھی عبدالعزیز تھا مکہ پر حملہ کرا کے شریف مکہ کو جزیرۂ قبرص میں لے جاکر نظربند کر دیا اور حجاز پر بھی آلِ سعود کا قبضہ کرا دیا جس کے بعد سے

اب تک سعودی حکمرانوں کا دارالسلطنت اگرچہ نجد میں ہے مگر وہ مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ سمیت تمام حجاز کے حکمراں ہیں ۔

پہلا باب

محمد بن عبد الوہاب کا عقیدہ جناب باری عزاسمہٗ کے باب میں

سب کو معلوم ہے کہ وہابی حضرات عموماً اپنے پیشوا کی پیروی میں خالص توحید کے دعویدار ہیں اور اپنے سوا تمام مسلمانوں کو مشرک سمجھتے ہیں لیکن جب خود ابن عبد الوہاب کی کتابوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ شخص خالق متعال کے بارے میں اپنے پیشرو ابن تیمیہ کی پیروی میں ایسا عقیدہ رکھتا ہے جس سے خالق کا جلال و کمال مجروح ہوتا ہے اور اس کی یکتائی جو توحید حقیقی کا تقاضا ہے' مجروح ہو جاتی ہے ۔ وہ اس طرح کہ قرآن مجید کے وہ آیات جن کے بعض الفاظ اپنے ظاہری ایک لغوی معنی کے لحاظ سے جسمیت کا تصور پیدا کرتے ہیں جیسے : یداہ مبسوطتان ' جس کے ایک لفظی معنی یہ ہیں کہ " اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں " اور علی العرش استوی جس کا ایک مفہوم یہ ہے کہ " وہ عرش پر سیدھا ہو کے بیٹھا " ۔ ان میں علمائے حق کا مسلک یہ ہے کہ چونکہ ان کا یہ مفہوم شان الٰہی کے خلاف اور عقلاً اس کے لیے غیر ممکن ہے' اس لیے ان کا ایسا مفہوم سمجھنا چاہیے جس کی محاورات عرب کے لحاظ سے ان الفاظ میں گنجائش بھی ہے ۔ اور وہ شان الٰہی کے خلاف بھی نہیں جیسے ید کے معنی قدرت اور استواء کے معنی غلبہ و اقتدار ' مگر ابن تیمیہ اور ان کی پیرو جن کے پیش رو اب آخر میں یہی شیخ ابن عبد الوہاب ہوئے' ان سب

الفاظ کو اُن کے ظاہری لغوی معنی پر محمل کرتے ہیں اور ان میں سے کسی میں بھی تاویل کے مخالف ہیں۔ اس طرح اُن کا تصور یہ ہے کہ وہ واقعی عرش پر بیٹھا ہے۔ اُس کے ہاتھ ہیں، پیر ہیں، پہلو ہے، آنکھیں ہیں، چہرہ ہے، زبان ہے، نفس ہے اور یہ سب چیزیں حقیقۃً ہیں۔ وہ آواز کے ساتھ بات کرتا ہے اور چڑھتا، اترتا، آتا، جاتا، ہنستا، روتا ہے۔

یہ بالکل وہ تجسیم ہے جس کے کفر ہونے پر عامۃ المسلمین متفق ہیں۔ مگر ان علمائے وہابیہ کی کتابیں ان باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ چنانچہ خود ابن عبدالوہاب کی ایک کتاب ہے " التوحید الذی ھو حق اللہ علی العبید " اس میں اس آیت قرآن کے ذیل میں کہ " حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ (سورۂ سبا آیۃ ۲۳) لکھا ہے:۔

" چھبیسویں بات:۔ صفات (یعنی زبان، دہن اور الفاظ کے ساتھ کلام وغیرہ) کا ثبوت ہے۔ فرقۂ اشاعرہ (مسلمانوں کی اکثریت) جو تعطیل (یعنی اس طرح کے صفات کی نفی) کا قائل ہے، اس کے خلاف ہے۔"

شارح نے اس کے ذیلی حاشیے (فٹ نوٹ) میں لکھا ہے:

" یہ اشعریہ فرقہ ابوالحسن اشعری کی طرف منسوب ہے اور اس فرقے نے اکثر صفات کا انکار کیا ہے جیسے اللہ کا اونچا ہونا اور تمام اپنے مخلوق سے الگ ہو کر عرش پر بیٹھنا اور اس کا محبت کرنا اپنے بندوں سے اور اس کا رحم ان پر اور اس کی رضامندی اُن سے اور اُس کا غضب وغیرہ وغیرہ مخالفت میں اس کی جو ان چیزوں کے بارے میں رسول خداؐ اور اُن کے اصحاب اور دیگر اسلاف صالحین سے وارد ہوا ہے۔"

اس کے بعد آخر کتاب میں ایک باب ہے اس مطلب پر اُن احادیث سے استدلال کے لیے جن سے اُن کے مسلک کی موافقت سمجھ میں آتی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

" یہ باب اُن احادیث میں ہے جو اس ارشاد الٰہی کے متعلق ہیں کہ انھوں نے اللہ کی اصل شان کو نہیں سمجھا ہے اور تمام زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن۔"

ابن مسعود کی روایت ہے کہ ایک یہودی عالم رسول خداؐ کے پاس آیا اور کہا:—

" اے محمدؐ! ہم (اپنی کتابوں میں) ایسا پاتے ہیں کہ اللہ تمام آسمانوں کو ایک انگلی میں لے گا اور زمینوں کو ایک انگلی میں اور درختوں کو ایک انگلی میں اور پانی کو ایک انگلی میں اور زمین کو ایک انگلی میں[1] اور باقی تمام مخلوق کو ایک انگلی میں اور ان سب کو اس طرح لے کر کہے گا میں اصل بادشاہ ہوں۔"

اس پر پیغمبرؐ ہنسنے لگے ایسا کہ ڈاڑھیں تک آپ کی نمودار ہو گئیں، اس یہودی عالم کی بات کی تصدیق کے طور پر۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِیْعًا قَبْضَتُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ (تا آخر آیت) (سورہ زمر آیۃ ۶۷)

مسلم کی ایک روایت میں یہ ہے کہ پہاڑ اور درخت ایک انگلی میں۔ پھر وہ ان سب کو جنبش دے کر کہے گا میں بادشاہ ہوں۔ میں اللہ ہوں۔

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آسمانوں کو ایک انگلی پر، پانی اور زمین کو ایک انگلی پر اور دیگر تمام مخلوق کو ایک انگلی پر۔ اسے دونوں (بخاری و مسلم) نے درج کیا ہے اور مسلم کی روایت ابن عمر سے یہ ہے کہ اللہ آسمانوں کو روز قیامت لپیٹ دے گا۔ پھر انھیں اپنے بائیں ہاتھ میں لے گا۔ پھر وہی کہے گا کہ میں بادشاہ ہوں۔ کہاں ہیں سرکش لوگ؟ کہاں ہیں اپنی بڑائی ظاہر کرنے والے؟ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں خدا کی ہتھیلی پر ایسی ہوں گی جیسے رائی کا دانہ تم میں سے کسی کے ہاتھ میں اور

---

[1] زمینیں تو ایک انگلی میں آچکی ہیں۔ اب معلوم نہیں یہ زمین کیسی ہے جو ایک اور انگلی میں ہے۔

ابن جریر کا بیان ہے کہ مجھ سے یونس بن وہیب نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ابوزید نے کہا کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا' کہا کہ رسول خداؐ نے فرمایا کہ ساتوں آسمان کرسی میں بس ایسے ہیں جیسے سات درہم (چاندی کے سکے) کسی سپر (ڈھال) میں اور ابوزید نے یہ بھی کہا کہ میں نے پیغمبر خداؐ کو فرماتے سنا کہ کرسی عرش کے اندر ایسی ہے جیسے لوہے کا ایک چھلا ایک بڑے جنگل کی پشت پر لٹکا ہوا رہا ہو اور ابن مسعود سے روایت ہے کہ آسمانِ دنیا اور اُس سے ملے ہوئے آسمان کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے اور اسی طرح ہر آسمان کا فاصلہ پانچ سو برس کی راہ کا ہے اور پھر ساتویں آسمان اور کرسی کے درمیان پانچسو برس کی راہ اور کرسی اور پانی کے درمیان پانچ سو برس کی راہ اور عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ عرش پر ہے۔ پھر بھی تمہارے اعمال میں سے کچھ اُس پر پوشیدہ نہیں رہتا۔ اس کی ابن مہدی نے روایت کی ہے حماد بن مسلمہ سے' انھوں نے عاصم سے' انھوں نے زر سے' انھوں نے عبداللہ بن مسعود سے اور اسی سے ملتی جلتی روایت کی ہے مسعودی نے عاصم سے' انھوں نے ابو وائل سے' انھوں نے عبداللہ سے۔ حافظ ذہبی نے کہا ہے کہ یہ حدیث کئی طریق سے وارد ہوئی ہے اور عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خداؐ نے فرمایا:

"تم جانتے ہو آسمان اور زمین کے درمیان کتنا فاصلہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اللہ اور پیغمبر زیادہ واقف ہیں۔ فرمایا ان کے درمیان پانچ سو برس کی راہ ہے اور ہر آسمان کا دوسرے آسمان سے فاصلہ پانچ سو برس کی راہ کا ہے اور ہر آسمان کی ضخامت پانچ سو برس کی راہ کے برابر ہے اور ساتویں آسمان اور عرش کے درمیان ایک سمندر ہے، اُس کے نیچے اور اوپر کی سطح کے درمیان ویسا ہی فاصلہ ہے جیسا آسمان اور زمین کے درمیان ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے اوپر ہے اور پھر بھی اُس پر آدمیوں کے اعمال میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رہتی۔"

اس کی ابوداؤد نے تخریج کی ہے اور اس میں چند مسئلے ہیں:-

پہلے اس آیت کی تفسیر کہ: "والارض جمیعًا قبضتہ یوم القیامۃ" زمین سب اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن۔

دوسرے یہ کہ یہ اور ایسے ہی معلومات اُن یہودیوں کے پاس باقی تھے جو حضرتؐ کے زمانے میں تھے۔ نہ انھوں نے انھیں غلط سمجھا تھا اور نہ ان کی تاویل کی تھی۔

تیسرے یہ کہ اُس یہودی عالم نے جب پیغمبرؐ کے سامنے اس کا ذکر کیا تو آپ نے اس کی تصدیق فرمائی اور قرآنی آیت اُس کی مطابقت میں نازل ہوئی!

چوتھے یہودی عالم کے اس بڑے علم کو بیان کرنے کے بعد پیغمبر خداؐ کا ہنسنا۔

پانچویں صراحت دونوں ہاتھوں کی اور یہ کہ آسمان داہنے ہاتھ میں ہوں گے اور زمینیں بائیں ہاتھ میں۔"

محمود شکری آلوسی نے جو خود وہابی المسلک تھے' "تاریخ نجد" میں "دین اہل نجد اور اُن کے افعال و اعمال" کے ذیل میں لکھا ہے کہ وہ صفات (یعنی ہاتھ، مُنھ وغیرہ) والے آیات اور احادیث کو ان کے ظاہری مفہوم پر برقرار رکھتے ہیں اور ان کے مطلب کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔

لیکن اگر وہ مطلب کو اللہ کے حوالے کرتے تو ان کے ظاہری مفہوم پر برقرار رہنے کا فیصلہ نہ کرتے۔

غور کرنے کے بعد ہر صاحب بصیرت شخص محسوس کر سکتا ہے کہ ان الفاظ کو ظاہری مفہوم پر محمول کرنا اسلامی تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتا اس لیے کہ اس سے خالق متعال کی جسمیت لازم آتی ہے اور مجسمہ کے کفر پر تمام مسلمان متفق ہیں اس لیے کہ وہ اصول توحید کے خلاف ہے۔ امام الالہیین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السّلام نہج البلاغہ کے پہلے ہی خطبے میں فرماتے ہیں:

"توحید کا مکمل ہونا یہ ہے کہ اُس سے صفات کی نفی کی جائے' اس لیے کہ ہر موصوف

اس کا گواہ ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کچھ ہے اور ہر صفت اس کی گواہ ہے کہ وہ موصوف کے علاوہ کچھ ہے تو جس نے اُس کے اوصاف مانے اُس نے اُسے ایک سے زیادہ مان لیا اور جس نے اُسے ایک سے زیادہ مانا اس نے اس کے اجزاء مان لیے۔"

ظاہر ہے کہ اگر خالق کے لیے اجزاء مان لیے جائیں تو یہ اجزاء یا واجب الوجود اور قدیم ہوں گے، یا حادث۔ اگر حادث ہوں تو خالق کی ذات حادث ہو جائے گی۔ اس لیے کہ حادث چیزوں سے مرکب چیز لازماً حادث ہو گی اور اگر واجب الوجود مانیں تو واجب الوجود اور قدیم بالذات ہونے میں خالق کے ہمسر دوسرے ہو جائیں گے جو شرک ہے۔ اس کے علاوہ واجب الوجود کا محتاج ہونا آلات اور اجزاء کی طرف لازم آئے گا اور محتاج ہونے کا لازمہ حدوث و امکان ہے۔

رہ گئے وہ آیات و احادیث جن سے اس غلط عقیدے پر استدلال کیا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں لہٰذا ہر لفظ کے وہ معنی قرار دیے جانا چاہئیں جو عقل و نقل کے لحاظ سے صحیح قرار پاتے ہوں مثلاً استوا کی لفظ کا ایک سطحی مفہوم سیدھے بیٹھنے کا ہے لیکن محل کے لحاظ سے اس کا بالکل درست مفہوم قدرت و غلبہ کے ساتھ قائم و برقرار ہونا ہے جو بالکل اصول محاورہ کے مطابق ہے اور شایانِ شانِ الٰہی۔ اسی طرح وجہ کے معنی وہ آثار قدرت ہیں جو معرفت الٰہی کا ذریعہ ہوتے ہیں جس کی نظیریں کلامِ عرب میں بکثرت ہیں۔ یونہی ید کے معنی تسلط و اختیار کامل کے ہیں۔

وہ یہودی عالم والی روایت جو بیان کی گئی ہے، درحقیقت اس عقیدے کے غلط ہونے کی دلیل ہے۔ اُس روایت میں یہودی کے قول پر حضرتؐ کے ہنسنے کے ساتھ یہ جملہ کہ "اُس یہودی کی بات کی تصدیق کے طور پر" یہ نہ کوئی رسولؐ کا قول ہے، نہ عمل

جسے جزءِ حدیث سمجھا جائے بلکہ یہ اس روایت کے بیان کرنے والے کا تصور ہے جو اُسکی نافہمی کی دلیل ہے۔ قرینِ عقل یہ ہے کہ حضرتؐ اس یہودی کی حماقت پر اتنی شدت سے ہنسے اور یہ آیت اُس کی رد میں پڑھی کہ انھوں نے اللہ کو اُس کی حقیقی شان کے ساتھ نہیں سمجھا۔ کائنات سب روزِ قیامت اُس کے قبضۂ قدرت میں ہو گی۔ نہ یہ کہ کائنات کی ایک ایک چیز کو وہ اپنی ایک ایک انگلی پر لے کر اُسے حرکت دینے کا کرتب دکھائے۔

اس خیال اور اس کے علاوہ دوسرے خیالات میں جن کا بعد میں ذکر آئے گا۔ ابن عبدالوہاب کے مقتدا ابوالعباس احمد بن تیمیہ حرّانی متوفی ۷۲۸ھ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے ان باتوں پر زور دیا اور اس بارے میں مستقل رسالے لکھے جیسے عقیدۂ حمویہ اور واسطیہ وغیرہ اور پھر ان کے شاگرد ابن القیّم جوزیہ اور ابن عبدالہاد وغیرہ اُن کے قدم بقدم چلے۔ علمائے اسلام نے ان کے کفر کا فتویٰ صادر کیا اور بعض نے ان کے جوازِ قتل کا حکم دیا تاہم وہ ایک طویل مدت تک قید رہے۔

اس محل پر ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ابن تیمیہ کے بارے میں جو وہابی عقائد کے بانی مبانی ہیں، علمائے اسلام کے تصریحات درج کیے جائیں جن سے پتہ چلے کہ جب پیشوا کی حیثیت یہ ہو تو پیرووں کی حیثیت کیا ہو سکتی ہے؟

علامہ ابن حجر مکی نے اپنی کتاب "جوہر منظم فی زیارۃ قبر النبی المکرم" میں لکھا ہے کہ:

"ابن تیمیہ کی لغزش ایسی ہے جس کا تدارک نہیں ہو سکتا اور ایسی مصیبت ہے کہ جس کا وبال زوال پذیر نہیں۔ اس شخص کو نفسانی خواہش نے آمادہ کیا کہ وہ علمِ اجتہاد بلند کر کے تمام علمائے سلف کے خلاف بہت سے مسائل میں اُن کے اجماع کی مخالفت کرے اور پیشوایانِ دین یہاں تک خلفائے راشدین

پر رکیک اعتراضات کرے، یہاں تک کہ بارگاہ الٰہی میں بھی گستاخیاں کریں۔ اس نے خدا کی شانِ جلال و جبروت کو صدمہ پہونچایا کہ عوام کے سامنے بالائے منبر صاف صاف اُس کے جسم ہونے اور سمتِ خاص میں ہونے کا اعلان کیا اور جو اس کا انکار کرے، اُسے گمراہ قرار دیا۔ یہاں تک کہ تمام علمائے زمانہ نے متفق ہو کر بادشاہِ وقت کو اس کے قتل یا قید کرنے پر مجبور کیا چنانچہ اس نے آخر عمر تک قیدِ ہستی سے رہا ہونے تک اُسے قید رکھا[۱] اور اس کے بعد یہ آگ ذرا خاموش ہوئی اور اندھیرے چھٹ گئے مگر پھر کچھ اس کے حامی وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے لیکن انھیں کوئی طاقت حاصل نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ ذلیل و رسوا اور غضبِ الٰہی میں گرفتار رہے۔"

انھوں نے اپنی دوسری کتاب "اشرف الوسائل الیٰ فہم الشمائل" میں لکھا کہ:

"علماء کو دونوں کاندھوں کے بیچ میں لٹکانے کے بارے میں کہ ابن قیم نے اپنے استاد ابن تیمیہ کے لیے کہا ہے کہ انھوں نے ایک نادر بات کہی ہے اور وہ یہ کہ جب آنحضرتؐ نے اپنے پروردگار کو اپنا ہاتھ ان کے کاندھوں کے بیچ میں رکھے ہوئے دیکھا تو اس جگہ کو یہ امتیاز عطا کیا۔ عراقی نے کہا کہ ہمیں اس کی کوئی اصل نہیں ملی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ان دونوں (ابن تیمیہ اور ابن قیم) کے دوسرے خیالات کی طرح کی چیز ہے جو مبنی ہے اُس تصور پر جو ان کا ہے اور جس کے ثابت کرنے میں انھوں نے بہت طول کلام سے کام لیا ہے اور اہل سنت پر طعن و تشنیع کی ہے کہ وہ اس کے منکر ہیں اور وہ اللہ کے لیے جہت اور جسم کا تجویز کرنا ہے

---

[۱] یہ جز غیر یقینی ہے اس لیے کہ بعد میں ایک دوسرے مصنف کا بیان آئے گا کہ دوبارہ وہ رہا ہوئے اور بعد میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔

(بالاتر ہے اُس کی ذات ان ظالموں کے خیالات سے) اور ان کے یہاں اس مقام پر اتنی خراب اور بد اعتقادی کی باتیں ہیں جن سے کانوں کو اذیت ہوتی ہے اور فیصلہ یہی ہوتا ہے کہ یہ غلط، جھوٹ، گمراہی اور بہتان کی باتیں ہیں۔ اللہ اُن کا بُرا کرے اور بُرا کرے اس کا جو اُن کے اقوال کا معتقد ہو اور امام احمد بن حنبل اور اُن کے مسلک کے بزرگ مرتبہ علماء اس بُرائی کے داغ سے بری ہیں اور کیونکر ایسا نہ ہو کہ یہ بہت سوں کے نزدیک کفر ہے۔"

لکھنؤ کے مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی "حل المعاقد حاشیہ شرح عقائد" میں لکھتے ہیں کہ:

"تقی الدین ابن تیمیہ حنبلی شخص تھا مگر وہ حد سے آگے بڑھ گیا اور ایسی باتوں کے ثابت کرنے کے درپے ہوا جو عظمت و جلال خداوند عالم کے خلاف ہیں کہ اس کے لیے سمت جہت اور جسم مان لیا اور بہت سے اس شخص کے ہفوات ہیں مثلاً حضرت عثمان کے لیے کہا کہ وہ مال سے محبت رکھتے تھے اور حضرت علی کے لیے کہا کہ اُن کا ایمان درست نہ تھا۔ اس لیے کہ بچپن میں ایمان لائے تھے اور اہل پیغمبر کے لیے ایسی باتیں کہیں جو کوئی مومن زبان پر نہیں لا سکتا۔ حالانکہ صحیح احادیث اُن کے مناقب میں کتب صحاح میں وارد ہوئے ہیں اور ایک جلسہ قلعۂ جبل میں ہوا اور وہاں اکابر علماء اس وقت کے جمع ہوئے جن کے راس و رئیس قاضی القضاۃ زین الدین مالکی تھے اور وہاں ابن تیمیہ کو بھی حاضر کیا گیا اور طولانی گفتگو کے بعد قاضی القضاۃ نے اُسے قید کرنے کا حکم دیا اور یہ ۷۰۵ھ کا واقعہ ہے۔ پھر دمشق وغیرہ میں اعلان ہوا کہ جو شخص ابن تیمیہ کے عقیدے پر ہو اُس کا جان و مال حلال ہے۔ اس کا ذکر مراۃ الجنان یافعی میں موجود ہے۔ پھر اس نے توبہ کی۔ اور ۷۰۷ھ میں قید سے رہائی پائی اور کہا میں "اشعری" مسلک کا پابند رہوں گا، پھر اس

عہد کو توڑا اور اپنے عقائد کا اظہار کیا تو دوبارہ قید سخت کی سزا ہوئی۔ پھر توبہ کی اور قید سے رہائی ہوئی اور شام میں قیام کیا اور وہاں بہت سے واقعات اس سلسلے میں پیش ہوئے جو کتب تاریخ میں مذکور ہیں۔"

علامہ ابن حجر مکی نے "درر کامنہ" جلد اول میں اور ذہبی نے اپنی تاریخ میں اس کے اقوال و حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ بیان تو درمیان میں ضمناً آگیا۔ اصل مطلب یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے چونکہ خدا کی جسمیت کو اختیار کیا لہٰذا کہا کہ اس کے لیے مکان ہے۔ اس لیے کہ ہر جسم کے لیے مکان ضروری ہے۔ اور چونکہ قرآن میں ہے "الرّحمٰن علی العرش استویٰ" اس لیے کہا کہ عرش ہی اس کا مکان ہے۔ اور چونکہ خداوند عالم ازل سے ہے اور عالم کے تمام اجزاء حادث ہیں اس لیے اسے مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ جنس عرش ازلی اور قدیم ہے لیکن اس کی لامتناہی شخصیتیں یکے بعد دیگرے وجود میں آتی رہتی ہیں تو مکان میں ہونے کی صفت خدا کی قدیم ہے اور مکان کے تعینات حادث ہیں۔

مرآۃ الجنان یافعی میں ابن تیمیہ کے فتنے کے ذکر میں ہے کہ مصر میں جو ان پر الزام عائد ہوا وہ یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا حقیقۃً عرش پر بیٹھا ہے اور وہ حروف اور آواز کے ساتھ کلام کرتا ہے اور اسی کے بعد دمشق وغیرہ میں اعلان کیا گیا کہ جو ابن تیمیہ کے عقیدے پر ہو اس کا جان و مال حلال ہے۔

ابوالفداء نے اپنی تاریخ میں ۷۰۵ھ کے حالات میں لکھا ہے کہ اس میں تقی الدین احمد ابن تیمیہ کو دمشق سے مصر بلایا گیا اور ایک جلسہ ہوا جس میں بحث مباحثے کے بعد طے ہوا کہ وہ ان اعتقادات کے سبب جیل میں ڈال دیا جائے۔ اس لیے کہ وہ جسمیت کا قائل ہے۔

اس کے علاوہ ہماری نظر سے اس اشتہار کی کچھ عبارتیں بھی گزری ہیں جو بادشاہ کی طرف سے اس شخص کے بارے میں شائع کیا گیا تھا۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بدنصیب ابن تیمیہ نے اس مدت میں اپنے قلم کی زبان کو بڑھا رکھا تھا اور اپنے الفاظ کی باگ ڈھیلی

کر رکھی تھی اور قرآن اور صفات الٰہی کے مسائل میں بحثیں اٹھائیں اور اپنے کلام میں بہت سی غلط باتوں کی صراحت کی اور ایسی باتوں میں گفتگو کی جن سے صحابہ و تابعین نے خاموشی اختیار کی تھی اور وہ باتیں زبان پر لایا جو سلفِ صالحین کے لیے ناقابل قبول تھیں اور وہ اعتقادات ظاہر کیے جنھیں ائمۂ اسلام نے غلط قرار دیا ہے اور جن کے خلاف تمام علمائے اسلام کا اجماع ہے اور اطرافِ ملک میں اس کے ایسے فتووں کی اشاعت ہو رہی ہے جن سے عوام گمراہ ہو رہے ہیں اور اس بارے میں اُس نے تمام علمائے عصر اور فقہائے شام و مصر کی مخالفت کی ہے۔ جب ہم تک یہ خبریں پہونچیں اور معلوم ہوا کہ ایک گروہ اُس کا بھی پیرو ہوگیا ہے اور وہ لوگ اللہ کے بارے میں حروف اور آواز اور جسمیت کی صراحت کرتے ہیں تو ہم اس کے خلاف کھڑے ہونے کے لیے مجبور ہوئے۔"

یہ منشور کافی طولانی ہے جس کے کچھ جملوں کا مطلب لکھا گیا ہے۔

اس سب سے معلوم ہوا کہ اس طرح صفات الٰہی اور جسمیت کا اعتقاد وہ ہے جس کے کفر ہونے پر علمائے اسلام متفق ہیں۔ اب اس سے ابن عبدالوہاب اور اُن کے پیروؤں کے متعلق رائے قائم کی جاسکتی ہے جو انہی باتوں کے قائل ہیں۔

سابق میں جو کچھ درج ہوا ہے، وہ اہل سنّت کے تصریحات تھے اور علمائے شیعہ کے تصریحات مجسّمہ کے کفر کے متعلق شرح لمعہ، ریاض المسائل، مسالک اور جواہر الکلام تقریباً تمام فقہ جعفری کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس طرح پوری امّت کا اجماع اُن کے کفر پر ثابت و متحقق ہوجاتا ہے۔

وَاللہُ عَدُوٌّ لِلکَافِرِین

دوسرا باب

وہابی عقیدہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں

ابن عبدالوہاب اور اُن کے پیرو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اپنی قبر میں مثل عام مرنے والوں کے ہو گئے کہ نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ نہ آپ کو اس کا اختیار ہے کہ مشرق و مغرب میں جہاں چاہے جائیں۔ اس کے علاوہ آپ کی قبر مطہر کی زیارت کے لیے سفر کر کے جانا ان کے نزدیک حرام ہے۔ اور آپ کے ساتھ توسل اور آپ کی قبر کے پاس دعا مانگنا جائز نہیں ہے اور یا رسول اللہ کہہ کر پکارنا شرک ہے۔ جو وفات کے بعد آپ سے مخاطب ہو کر کوئی حاجت طلب کرے، وہ مشرک ہے کہ اس کا جان و مال حلال ہے۔ اسکو بخیال خود ثابت کرنے کے لیے وہ آیات و احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو درحقیقت اس پر دلالت نہیں کرتے اور تمام مسلمان متفق ہیں کہ حضرتؐ بعد وفات زندہ ہیں، نہ ایسی زندگی جو بنص قرآن شہداء کے لیے بھی ثابت ہے بلکہ اُس سے بدرجہا زیادہ مکمل زندگی۔

یہ تصور کہ حضرتؐ کی قبر مطہر کی زیارت کے لیے سفر کرنا ممنوع ہے، اس کی بنیاد ایک حدیث پر ہے جو اہل سنت کے یہاں وارد ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

سوا تینؔ مسجدوں کے کسی جگہ کے لیے شد رحال یعنی سفر کر کے جانا جائز نہیں ہے۔ اسے جو اپنے مقصد کی دلیل بنا کر پیش کیا جاتا ہے، یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ ذرا بھی جو عربی سے واقف ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مسجدوں میں بس یہ تین مسجدیں ہیں جن کے لیے خاص طور پر سفر کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ مستثنیٰ منہ کا مستثنیٰ کی جنس سے ہونا ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے عمر بھر میں بس وہ مسجد دیکھی ہے اُس کے سوا کوئی نہیں تو ہر ایک یہی سمجھے گا کہ مسجد کوئی اور نہیں دیکھی۔ یہ تھوڑی کہ کوئی عمارت دوسری یا کوئی چیز دوسری نہیں دیکھی۔ اسی طرح اس سے کہ سوا تین مسجدوں کے اور کسی کے لیے سفر نہ کیا جائے مسجدوں میں انحصار ثابت ہوگا لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ روضۂ رسولؐ کے لیے سفر کرنا جائز نہیں ہے۔ ورنہ پھر ایک شہر سے دوسرے شہر تجارت وغیرہ کے لیے بھی سفر جائز نہ ہونا چاہیے جس کا غلط ہونا ظاہر ہے اور کئی مرتبہ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بسلسلہ تجارت شام کا سفر فرمایا اور اس کا ثبوت ملتا ہے۔ امام احمد بن حنبل کی روایت سے جس کا مضمون یہ ہے کہ کسی مسجد کی طرف جہاں ذکر الٰہی ہوتا ہے سفر کر کے جانا نہیں ہوگا سوا تینؔ مسجدوں کے۔ ایسے سید مصطفیٰ نورالدین حسینی نے اپنی کتاب "خلاصۃ المقال فی شد الرحال" میں درج کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حدیثیں ایک دوسرے کی تشریح کرتی ہیں۔ اور حکم مطلق کی وضاحت مقید سے ہوتی ہے اور برابر تمام مسلمان اور ہر دور کے علماء روضۂ رسولؐ کی زیارت کے لیے سفر کرتے رہے اور کسی نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ اس سے تمام مسلمانوں کا اجماع و اتفاق ثابت ہوتا ہے اور جن لوگوں نے بعد میں اس کے مخالف راہ اختیار کی، وہ جماعت سے نکل گئے اور اجماعی راستے سے منحرف ہو گئے۔

بعض احادیث سے بھی زیارت کے لیے سفر کا ثبوت ملتا ہے۔ جیسا کہ علی بن برہان الدین شافعی کی کتاب "انسان العیون" میں ہے کہ:

"جب جناب رسول خداؐ کی وفات ہو گئی تو بلالؓ شام کی طرف چلے گئے اور

کہا اب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مدینے کی صورت نہیں دیکھوں گا۔ عرصے تک وہاں رہے مگر ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں اے بلال! تم نے ہمارا جوار چھوڑ دیا اور شام میں قیام کر لیا تو کیا اب ہماری زیارت کے لیے بھی نہیں آتے؟ پس جونہی وہ بیدار ہوئے انھوں نے سفر کی تیاری کر دی اور مدینہ آئے اور قبرِ پیغمبرؐ کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے۔"

اور یہ احادیث صحاح سے ثابت ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا اُس نے حضرتؐ ہی کو دیکھا ہے۔ اس لیے کہ شیطان حضرتؐ کی صورت میں نہیں آسکتا۔ اس سے سفر کرنا زیارتِ قبرِ رسولؐ کے لیے خود حکمِ رسولؐ سے ثابت ہو جاتا ہے جس سے انکار کی کسی کو گنجائش نہیں ہے۔

ابن عبدالوہاب نے اس قول کو بھی اپنے پیش رو ابن تیمیہ اور ابن قیم سے لیا ہے کہ ان دونوں نے سب سے پہلے یہ صدا بلند کی اور اسے ثابت کرنے میں طول کلام سے کام لیا اور علمائے اسلام نے اُس کی رَد میں مستقل کتابیں تحریر کیں جیسے "شفاء السقام فی زیارة خیر الانام" جو آٹھویں صدی کے قاضی القضاۃ شیخ حافظ تقی الدین حسن سبکی کی تصنیف ہے اور "جوہر منظم فی زیارة قبر النبی المکرّم" از علامہ ابن حجر مکی ہیتمی اور "منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال" از مفتی صدر الدین۔ اور "خلاصة المقال فی شدّ الرحال" از سید مصطفیٰ نور الدین الحسینی وغیرہ وغیرہ۔

یہاں کچھ ان کتابوں کے اقتباسات اور کچھ دیگر علمار کے ارشادات جو ضمناً دوسری کتابوں میں اس موضوع سے متعلق ہیں، درج کیے جاتے ہیں۔

علامہ سبکی نے اپنی کتاب کے مقدمے میں لکھا ہے کہ:

"بارگاہِ الٰہی میں تقرب کے بہترین اسباب میں سے حضرت سرور کائناتؐ

کی قبرِ مطہر کی زیارت اور اطرافِ عالم سے اس کے لیے سفر ہے جیسا کہ شرق و غرب کے تمام مسلمانوں میں سالہا سال سے جاری وساری ہے اور ان باتوں میں جو شیطان نے اس زمانے میں بعض بدنصیبوں کی زبان پر جاری کی ہیں اس میں شک پیدا کرنا ہے اور یہ شک اُن کے دل میں ہرگز نہیں آسکتا جو سچے معنی میں مسلمان ہوں اور یہ ایک وسوسہ ہے ایسے بدنصیب کا پیدا کیا ہوا جس کا وبال اس پر آئے گا اور اس پر وہی احکام جاری ہوں گے جو قانون الٰہی نے صاف طور پر ایسے اشخاص کے لیے نافذ کیے ہیں اور باطل شبہے فنا ہو کر رہتے ہیں۔"

دوسری جگہ اس کتاب میں لکھا ہے:

"ابن تیمیہ کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں اور دینی اصول اور اسلافِ صالحین کی سیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت سے نیکوکار و پرہیزگار اموات کے آثار کو متبرک سمجھتے رہے ہیں۔ چہ جائیکہ انبیار و مرسلین اور جو اس کا دعوائے کرے کہ انبیار کے مقدس قبور اور عام مسلمانوں کی قبریں یکساں ہیں، اس نے انتہائی غلط دعوائے کیا جس کے باطل ہونے کا ہم یقین رکھتے ہیں، اور اس میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبے کو عام مسلمانوں کی سطح تک گھٹانا ہے اور یہ یقیناً داخل کفر ہے۔ اس لیے کہ جو رسولؐ کے مرتبے کو اُس کی شایانِ شان سطح سے گرائے وہ کافر ہے اور اگر وہ کہے کہ یہ را ما نہیں ہے بلکہ اُن کے مناسب درجے سے اُن کی عظمت کو بڑھانے سے روکنا ہے تو یہ بھی جہالت اور گستاخی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ پیغمبرِ خداؐ اس سے بھی زیادہ تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں زندگی میں بھی اور اپنی وفات کے بعد بھی اور اس میں شک نہیں کر سکتا وہ جس کے دل میں ذرا بھی ایمان ہو۔"

علامہ ابن حجر، جوہر منظم میں لکھتے ہیں :-

" اگر تم کہو کہ ہم زیارت قبر مطہر اور اس کے لیے سفر کے مطابق شرع ہونے پر اجماع کیونکر مان سکتے ہیں حالانکہ حنبلی جماعت میں سے ابن تیمیہ اس سب کے موافق شرع ہونے کے منکر ہیں جیسا کہ سبکی نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ ابن تیمیہ نے اس پر بہت طولانی استدلال کیا ہے بلکہ انھوں نے یہ دعوے کیا ہے کہ سفر اس زیارت کے لیے اجماعاً حرام ہے۔ اور اس میں نماز قصر نہ ہوگی اور یہ کہ جتنی حدیثیں اس کی فضیلت میں ہیں سب وضعی ہیں اور بعد میں بھی کچھ علمار نے اس قول کی پیروی کی ہے تو میں کہوں گا کہ ابن تیمیہ کون ہے جس کی طرف نظر ڈالی جائے اور دین کے معاملات میں سے کسی میں اس پر بھروسا کیا جائے اور وہ تو جیسا کہ ایک جماعت نے جیسے عز بن جماعہ، اس کے اقوال اور بے قیمت دلائل کا جائزہ لیا ہے اور اس کے توہمات اور غلطیوں کا اظہار کیا ہے، ایک ایسا شخص ہے جسے اللہ نے گمراہوں میں داخل کیا ہے اور اسے رسوائی کی چادر اڑھادی ہے اور ہلاکت کا مستحق قرار دیا ہے اور انتہائی افترا پردازی اور دروغ بیانی سے اس نے اپنے لیے وہ جگہ بنائی ہے جو اس کی سبکی اور رحمتِ خدا سے محرومی کا سبب ہے اور شیخ الاسلام تقی سبکی نے جن کی بزرگی، اجتہاد، پرہیزگاری اور پیشوائی مسلّم ہے اس کی رد میں ایک مستقل کتاب تحریر کی ہے اور اس میں مستحکم دلائل سے صحیح راستے کو واضح کیا ہے۔"

مفتی صدرالدین نے منتہی المقال میں لکھا ہے کہ :

" بزرگ مرتبہ عالم متبحر، محدثین کے محل استناد شیخ محمد برلسی نے اپنی کتاب " اتحاف اہل العرفان برؤیۃ الانبیاء والملائکہ والجان" میں

لکھا ہے کہ ابن تیمیہ حنبلی نے جرأت و جسارت سے کام لیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر کی زیارت کے لیے سفر حرام ہے اور یہ کہ نماز اس سفر میں قصر نہ ہوگی۔ اس لیے کہ یہ سفر معصیت ہے اور اس میں ایسے طول کلام سے کام لیا ہے جس کے سننے سے کان انکاری ہیں اور طبیعتیں متنفر ہوتی ہیں اور اس کلام کی نحوست اس کے شاملِ حال رہی، یہاں تک کہ اس کی جسارت بارگاہ عزّ و جلال حضرت باری تک پہونچ گئی اور اس نے عظمتِ خالق کے پردے کو شگافتہ کر دیا اور ایسی باتوں کے ثابت کرنے کی کوشش کی جو اس کی شانِ عظمت و کمال کے خلاف ہیں کہ خدا کے لیے سمت و جہت اور جسمیت کا دعویٰ کیا اور جو اسے نہ مانے اسے گمراہ اور گنہگار قرار دیا اور اس کا منبروں پر اعلان کیا اور اس کا چرچا ہر طرف پھیلا اور علمائے مجتہدین کی جو اس کے پہلے ہوئے ہیں بہت سے مسئلوں میں مخالفت کی اور خلفائے راشدین پر بھی اور پوچ اعتراضات کیے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ شخص اس دور کے تمام علمار کی نظر سے گر گیا اور عوام و خواص سب میں اس پر انگشت نمائی ہوئی اور علمار نے اس کے غلط اقوال کا جائزہ لیا اور اس کے دلائل کی رد کی اور اس کی لغزشوں کو نمایاں کیا اور اس کے توہمات اور غلطیوں کو واضح کیا۔"

احمد بن شہاب الدین خفاجی نے "نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض" میں اس حدیثِ رسولؐ کے درج کرنے کے بعد کہ "اللہ لعنت کرے یہود و نصاریٰ پر کہ انھوں نے اپنے انبیار کی قبروں کو محل سجدہ بنا دیا" لکھا ہے :

" معلوم ہونا چاہیے کہ اس حدیث کی وجہ سے ابن تیمیہ اور اس کے تابعین جیسے ابن قیم نے اپنا وہ رسوائے زمانہ تصور قائم کیا جس کی وجہ سے

سب نے انھیں کافر قرار دیا اور سبکی نے ایک مستقل کتاب اس پر لکھی اور وہ زیارتِ قبرِ رسولؐ اور اس کے لیے سفر کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ انھوں نے بخیال خود توحید کے پہلو کا تحفظ کیا ایسے جملات کے ساتھ جن کا ذکر بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ کسی صاحبِ عقل کی زبان پر نہیں آ سکتے، چہ جائیکہ کسی فاضل آدمی کی زبان پر۔

ملّا علی قاری نے شرح شفا کی دوسری جلد میں لکھا ہے کہ:

"حنبلیوں میں سے ابن تیمیہ نے تفریط سے کام لیا کہ زیارتِ رسولؐ کے لیے سفر کو حرام قرار دیا جس طرح دوسروں نے افراط سے کام لیا کہ انھوں نے کہا کہ زیارت کا داخلِ عبادات ہونا ضروریاتِ دین میں سے ہے اور اس کے منکر پر حکمِ کفر جاری ہے اور غالباً یہ دوسرا تصور حقیقت سے زیادہ قریب ہے اس لیے کہ جس چیز کے مستحب ہونے پر اجماعِ علماء ہو اس کا حرام کہنا کفر ہوگا اس لیے کہ یہ بالاتر ہے اس کہ کسی متفقہ طور پر مباح چیز کو حرام کہا جائے جس کے کفر ہونے پر اتفاق ہے۔"

کشف الظنون میں ہے کہ علماء نے ابن تیمیہ کے بارے میں بڑے افراط سے کام لیا ہے کہ صراحتہً لکھا ہے کہ

"جو ابن تیمیہ کو "شیخ الاسلام" کہے وہ بھی کافر ہے۔"

ان تمام عبارتوں سے معلوم ہوا کہ بہت سے علماء ابن تیمیہ کے کفر پر اس قول کی وجہ سے متفق ہیں۔

شیخ ابن حجر مکی نے "درر کامنہ" میں لکھا ہے کہ:۔

"لوگ ابن تیمیہ کے بارے میں کئی قسم کے ہیں۔ کچھ تو اسے مجسّمین داخل کرتے ہیں، چونکہ عقیدۂ حمویہ اور واسطیہ وغیرہ میں لکھا ہے کہ ہاتھ اور پیر اور

پنڈلی اور چہرہ سب حقیقتہً اللہ کے لیے ثابت ہیں۔ اور وہ بذاتِ خود عرش پر بیٹھا ہوا ہے۔ کہا گیا کہ اس سے مکانِ خاص میں ہونا اور اس کا اجزاء پر تقسیم ہونا لازم آتا ہے تو کہا ہم یہ نہیں مانتے کہ مکانِ خاص میں ہونا اور اجزاء کا ہونا جسم کے خصوصیات میں سے ہے تو کہا گیا کہ بہرحال یہ شخص خدا کو لامکان نہیں مانتا اور اس کے لیے جزو مکان کا قائل ہے اور کچھ لوگ اسے بے دین اس لیے مانتے ہیں کہ اس کا قول ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فریاد نہیں کی جا سکتی۔ اس میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تنقیص ہے اور آپ کی تعظیم سے روکنا ہے۔ سب سے زیادہ تشدد اس بارے میں نور بکری کو تھا کہ جب اس بارے میں اجتماع ہوا تو بعض حاضرین نے کہا کہ اس شخص کو تعزیر لازم ہے تو انھوں نے کہا کہ اس کے کوئی معنی نہیں اس لیے کہ اگر اس سے رسولؐ کی تنقیص ہوتی ہے تو حکمِ قتل ہونا چاہیے اور اگر تنقیص نہیں ہوتی تو حکمِ تعزیر بھی کیوں ہو؟ کچھ لوگ منافق کا حکم جاری کرتے ہیں حضرت علیؑ کے بارے میں یہ کہنے سے کہ انھوں نے جدھر بھی رخ کیا وہ ناکام و نامراد رہے اور انھوں نے کئی دفعہ خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر نہیں پا سکے اور انھوں نے جنگیں صرف اقتدار کے لیے کیں، نہ کہ دین کے لیے اور وہ اقتدار کے خواہش مند تھے اور عثمان مالِ دنیا سے بڑی محبت رکھتے تھے اور اس کا یہ قول ہے کہ ابوبکر بوڑھے تھے، سمجھتے تھے کیا کہہ رہے ہیں اور علیؑ بچپن میں ایمان لائے اور بچے کا اسلام قابلِ قبول نہیں۔ اور دخترِ ابوجہل کی خواستگاری کے سلسلے میں جو کچھ کہا ہے، اس سب میں حضرت علیؑ کے خلاف طعن و تشنیع ہے۔ اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے جو حضرت

علیؑ سے مخاطب ہو کر ارشاد فرمائی تھی کہ تمھیں دشمن نہیں رکھے گا کوئی سوا منافق کے۔

کچھ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ شخص امام اُمّت بننے کا خواب دیکھتا تھا۔ اس لیے کہ وہ ابن تومرت کا بہت ذکر کرتا تھا اور اس کی تعریفیں کرتا تھا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے وہ طولانی مدّت تک قید میں رکھا گیا اور اس سلسلے میں بہت سے واقعات ہیں جو مشہور ہیں اور وہ جب قائل کیا جاتا تھا تو کہہ دیتا تھا کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب دوسرا تھا اور پھر ایک بہت دور و دراز کا مفہوم بیان کر دیتا تھا۔"

ان تمام علمار کے اقوال سے ثابت ہو گیا کہ زیارتِ رسولؐ کے لیے سفر کے استحسان پر مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے اور جو اس کا منکر ہے وہ ضروریاتِ دین میں سے ایک چیز کا منکر ہے۔

بحثِ توسّل

توسّل رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے اللہ کی بارگاہ میں اس کے لیے قرآن مجید سے بھی ثبوت موجود ہے اور بکثرت احادیث بھی ہیں اور صحابہ و تابعین کے آثار بھی اور پھر تبع تابعین اور تمام اُمّتِ اسلامیہ کا عملدرآمد بھی ہے جن میں سے ہر ایک یکے بعد دیگرے ذیل میں درج ہے۔

قرآنِ مجید سے توسّل کا ثبوت

رسولؐ سے خطاب کر کے قرآن مجید میں ارشاد حضرتِ احدیت ہے کہ:

"کیوں نہیں ہوا ایسا کہ جب انھوں نے (گناہوں کے ارتکاب سے) اپنے

اوپر ظلم کیا تھا تو وہ آپ کے پاس آتے اور آ کر اللہ سے مغفرت طلب کرتے اور پیغمبر اُن کے لیے استغفار کرتے تو اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے"۔ (آیہ)

اب ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر پیغمبرؐ سے توسّل مطلوب نہ ہوتا تو بجائے خود اُن کا استغفار کافی تھا۔ یہ حکم نہ دیا جاتا کہ وہ رسولؐ کے پاس آئیں اور آپ کے پاس آ کر استغفار کریں اور اس کی ضرورت نہ ہوتی کہ رسولؐ ان کے لیے استغفار کریں۔ ظاہر ہے کہ خداوند عالم بذاتِ خود "توّاب الرحیم" ہے مگر یہاں اُس نے اپنے توّاب و رحیم ہونے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔ اس سے بڑھ کر توسّل کے مطلوب الٰہی ہونے کی دلیل کیا ہو سکتی ہے؟

اَحادیث و آثار صَحابہ و تابعین

(۱)

جنابِ آدم کا توسّل

اس کا ذکر متعدد احادیث میں ہے۔ منجملہ ان کے وہ ہے جسے حاکم نے مستدرک میں درج کیا ہے اور اُسے صحیح قرار دیا ہے کہ جب حضرت آدمؑ سے "ترک اولیٰ" ہوا تو انھوں نے کہا پروردگارا! میں تجھ سے محمد مصطفےٰؐ کے حق کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے۔ ارشاد الٰہی ہوا کہ اے آدم! تم نے انھیں کیونکر پہچانا؟ عرض کیا کہ اس وجہ سے کہ جب تو نے مجھے خلق کیا تو میں نے عرش پر نظر ڈالی تو اس میں

لکھا ہوا دیکھا "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ۔ اُن کا نام میں نے تیرے نام کے ساتھ دیکھا تو سمجھا کہ وہ تمام خلق میں تجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں "

(۲)

بطور نمونہ عمل خود رسول خدا کا توسل

طبرانی کی روایت ہے معجم کبیر اور اوسط میں نیز ابن حبان اور حاکم نے صحیح ہونے کی تصدیق کے ساتھ انس بن مالک کی زبانی درج کیا ہے کہ جب جناب فاطمہ بنت اسد رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات ہوئی جنھوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پرورش کی تھی تو حضرتؐ اُن کے سرھانے بیٹھے اور کہا اللہ کی رحمت آپ کے شامل حال ہو، اے میری ماں ان کے بعد میری ماں ! اس کے بعد جب لحد بنانے کا وقت آیا تو اپنے ہاتھ سے اُسے کھودا اور اس کی مٹی اپنے ہاتھ سے نکالی اور جب لحد تیار ہو گئی تو حضرتؐ خود اس میں لیٹے اور کہا " اللہ جو زندہ کرتا ہے اور موت دیتا ہے اور وہ خود زندہ ہے ایسا جسے موت نہیں ۔ پروردگارا ! میری ماں فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما اور ان کے محل میں وسعت عطا فرما ۔ تجھے واسطہ اپنے پیغمبرؐ اور ان پیغمبروں کا جو میرے پہلے تھے ۔ تو تمام رحمت والوں میں سب سے زیادہ رحمت والا ہے "

اور ابن ابی شیبہ نے ایسی ہی روایت جابر کی زبانی نقل کی ہے اور اسی طرح ابن عبد البر نے ابن عباس سے اور ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں انس سے ۔

ان تمام روایات کا ذکر حافظ سیوطی نے جامع کبیر میں کیا ہے ۔

یہ ظاہر ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو خود توسل کی ضرورت نہ تھی مگر اپنی امت کو اس طریقے کے اختیار کرنے کی تعلیم دینا تھی ۔

---

(۳)

رسولؐ کے واسطے سے جناب ابو طالبؑ کا طلب باراں

عم رسولؐ حضرت ابو طالبؑ نے حضرتؐ کو ساتھ لے جا کر طلب باراں کیا ۔ فوراً باران رحمت آ گیا ۔ اس پر انھوں نے ایک قصیدہ کہا جس کے دو شعر اس مضمون کے ہیں کہ :

" وہ گورا چٹا جس کے چہرے کے ذریعے سے ابر سے بارش حاصل کی جائے ۔
وہ یتیموں کا جائے پناہ اور رانڈوں کے لیے سبب حفاظت ہے ۔ پناہ لیتے ہیں اس کی طرف بنی ہاشم کے تباہ حال افراد تو وہ اس کے پاس احسانات میں گھرے رہتے ہیں "

ان اشعار کو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اتنا پسند فرمایا کہ بعد میں ان اشعار کو اور اُن کے نظم کرنے والے ابو طالب کو یاد فرمایا جیسے حافظ جلال الدین سیوطی نے خصائص کبریٰ میں درج کیا ہے ۔

(۴)

حضرتؐ کے طلب باراں پر ایک شاعر کے اشعار

سیوطی نے خود حضرتؐ کے طلب باراں کے بعد بارش ہونے کے ذکر میں لکھا ہے کہ قبیلۂ کنانہ کے شاعر نے اس سلسلے میں اشعار پڑھے وہ اشعار سیوطی نے درج کیے ہیں ۔ ان میں اس شاعر نے جناب ابو طالب کے اشعار کا بھی حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ پیغمبرؐ کے چہرے کے ذریعے سے ہمیں بارش نصیب ہوئی اور وہ ویسے ہی ہوئے جیسا کہ ان کے چچا ابو طالب نے ان کے بارے میں کہا تھا ۔ حضرتؐ

شاعر کی تعریف فرمائی اور اس طرح اُس کے ان الفاظ کی تصدیق فرمائی کہ پیغمبرؐ کے چہرے کی بدولت ہمیں بارش نصیب ہوئی۔

(۵)

ایک نابینا کو رسولؐ کی تعلیم

بخاری نے اپنی تاریخ میں اور بیہقی نے دلائل میں صحت کی تصدیق کرتے ہوئے اور ابونعیم نے کتاب المعرفۃ میں عثمان بن حنیف سے روایت کی ہے کہ ایک نابینا پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر کہنے لگا کہ اللہ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے بینائی عطا کرے۔ آپؐ نے فرمایا: چاہو تو صبر کرو اور دعا نہ کراؤ اور چاہو تو دعا کر دوں۔

ابن ماجہ کی روایت میں یوں ہے کہ چاہو تو اللہ سے دعا کردوں اور چاہو تو صبر کرو کہ وہ تمہارے لیے بہتر ہے۔

بہرصورت اس نے کہا آپ دعا کر دیجئے۔ حضرتؐ نے فرمایا: اچھا تو پھر پوری عمدگی کے ساتھ وضو کرو، پھر دو رکعت نماز پڑھو اور اس کے بعد ان الفاظ کے ساتھ دعا کرو کہ پروردگارا! تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں تیرے پیغمبرؐ محمدؐ کے واسطے سے جو رحمت کے پیغمبر ہیں اور اے محمدؐ میں نے آپ کے واسطے سے رُخ کیا ہے اپنے اللہ کی طرف کہ وہ میری اس حاجت کو پورا کرے۔ پروردگارا! تو ان کی سفارش کو میرے بارے میں قبول فرما۔ جب اس شخص نے ایسا ہی کیا تو اُس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

(۶)

سواد بن قارب کے اشعار

طبرانی نے معجم کبیر میں سواد بن قارب کا واقعہ لکھا ہے۔ اس میں ہے کہ انھوں

نے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے اپنا قصیدہ پڑھا۔ اُس میں تھا کہ تمام پیغمبروں میں آپ کا وسیلہ اللہ کے یہاں سب سے زیادہ قریب ہے اور پھر یہ کہ "آپ میری شفاعت کیجئے گا۔ ان میں سے کسی بات پر حضرتؐ نے اعتراض نہیں فرمایا۔

(۷)

خلیفۂ اوّل ابوبکر کا توسّل

شرح دلائل الخیرات میں حضرت ابوبکر کے متعلق ہے کہ وہ حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبرِ مطہر پر آئے اور کہا:

"اے محمدؐ! میں آپ سے توسل کرتا ہوں۔"

(۸)

اُمّ المومنین عائشہ کا توسل

عماد الدین عامری کی کتاب "بہجۃ المحافل" میں ہے کہ اہلِ مدینہ شدید قحط میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے جناب عائشہ سے شکایت کی۔ انھوں نے کہا:

"پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبرِ مطہر پر چھت میں ایک روشن دان کر دو کہ اس کے اور آسمان کے بیچ میں کوئی چیز حائل نہ رہے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا تو شدید بارش ہوئی کہ نباتات اور حیوانات سب پر اُس سیرابی کا خوشگوار اثر ہوا۔"

(۹)

خلیفۂ ثانی عمر کا توسّل

حافظ ابونعیم اصفہانی نے "دلائل النبوۃ" میں انس کی زبانی لکھا ہے کہ حضرت عمر

طلبِ باراں کے لیے نکلے اور عباس بن عبد المطلب کے ذریعے سے طلبِ باراں کرتے ہوئے کہا:

"خداوندا! پہلے جب قحط پڑتا تھا تو ہم تیرے پیغمبرؐ سے توسل کرتے تھے اور اب ہم اپنے پیغمبرؐ کے چچا کے ذریعے سے تجھ سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں بارش سے سیراب فرما۔"

چنانچہ بارش ہوئی۔

اس واقعے کو جاحظ نے "البیان والتبیین" میں دو جگہ درج کرنے کے بعد لکھا ہے کعب الاحبار نے حضرت عمر سے کہا کہ بنی اسرائیل جب قحط میں مبتلا ہوتے تھے تو پیغمبروں کے پدری رشتہ داروں کے ذریعے سے طلبِ باراں کرتے تھے۔ ان کے اس کہنے سے حضرت عمر نے جناب عباس بن عبد المطلب کے ذریعے سے طلبِ باراں کیا۔

تاریخ میں ہے کہ جب بارش ہوئی تو لوگ جناب عباسؓ سے مسح کرنے لگے۔ ہاتھ اُن کے جسم سے لگا کر اپنے چہرے پر پھیرنے لگے اور کہتے تھے مبارک ہو آپ کو اے حرمین (مکے اور مدینے) کو سیراب کرنے والے۔ چونکہ جناب عباسؓ دورِ اسلام سے قبل اور پھر بعد اسلام ساقی الحجیج یعنی مکہ معظمہ کے حجاج کو پانی پلانے کے انتظام کے ذمہ دار تھے۔ اس طرح حرمِ خدا (مکہ معظمہ) کے لوگوں کو سیراب کرنا اُن کا کام تھا اور آج وہ اس بارانِ رحمت کے نزول کا سبب بن کر حرمِ رسولؐ یعنی مدینے کے سیراب کرنے والے ثابت ہیں۔ لہٰذا ان کو سب "ساقی الحرمین" کہہ رہے تھے لیکن کسی نے ان لوگوں کا منھ بند نہیں کیا کہ یہ شرک ہے؟ اس کا ذکر ابن اثیر جزری نے "اسد الغابہ" میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس بارے میں حسان بن ثابت نے اشعار کہے جن میں ہے کہ "لوگوں نے قحط سالی کی شدت میں سوال کیا تو عباس کے چہرے کے

واسطے سے ابرنے باراں سے سیراب کیا۔

اس شعر میں توسل بھی ہے اور سیراب کرنے کی نسبت خدا کی طرف نہیں؟ ابر کی طرف ہے جو وہابی نقطۂ نظر سے شرک ہے۔

(پھر کہا ہے) "ان کی بدولت اللہ نے ان شہروں کو زندہ کر دیا اور چاروں طرف شادابی نظر آنے لگی"۔

ایک روایت میں ہے جو جناب ابن عباس رضوان اللہ علیہ کی زبانی ہے کہ حضرت عمر نے کہا:

"خداوندا! ہم تجھ سے اپنے پیغمبرؐ کے چچا کا واسطہ دے کر سیرابی طلب کرتے ہیں اور ان کی سفید داڑھی کو سفارش کے لیے لائے ہیں۔ اس کے بعد بارش ہوئی۔

(۱۰)

قبرِ رسولؐ پر جا کر رسولؐ سے فریاد

استیعاب ابن عبد البر میں ہے کہ زمانۂ عمر میں ایک دفعہ جو قحط پڑا تو مسلمانوں میں سے ایک شخص بیہقی نے لکھا ہے کہ وہ اصحابِ رسولؐ میں سے بلال بن حارث تھے۔ یہ قبرِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آئے اور کہا یا رسول اللہ! اپنی اُمت کے لیے طلبِ باراں کیجئے کہ یہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ اس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

(۱۱)

نابغۂ جعدی کی قبرِ رسولؐ سے فریاد

خلیفۂ سوم عثمان کے زمانے میں عمالِ حکومت نے نابغۂ جعدی کے ساتھ تشدد

سے کام لیا تو نابغہ نے کچھ اشعار نظم کیے جن میں کہا ہے کہ :

"اے پیغمبر اور ان کے دونوں ساتھیوں کی قبر! ہم آپ سے فریاد کر رہے ہیں۔"

اور یہ نابغہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بزرگ مرتبہ صحابی ہیں۔

(۱۲)

عبداللہ بن عمر کی رسولِ خداؐ سے فریاد

شفائے قاضی عیاض میں ہے کہ عبداللہ بن عمر کے پیر میں ایک دفعہ خاص تکلیف ہوگئی۔ کسی نے کہا جو سب سے زیادہ آپ کا محبوب ہو، اُسے پکارئیے۔ انھوں نے کہا

"وَامحمّداہ"

بس یہ کہتے ہی اُن کے پیر کی تکلیف دور ہوگئی۔

(۱۳)

عثمان بن حنیف کی توسّل کے لیے ہدایت

بیہقی نے اور ابونعیم نے کتاب المعرفۃ میں درج کیا ہے۔ سہل بن حنیف کا بیان ہے کہ ایک شخص خلیفۂ سوم عثمان کے پاس کسی ضرورت سے جاتا تھا اور وہ اُس کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ اُس نے عثمان بن حنیف سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا جاکر وضو کرو۔ پھر مسجد میں جاکر دو رکعت نماز پڑھو۔ پھر کہو خداوندا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف رُخ کرتا ہوں، تیرے پیغمبر حضرت محمدؐ نبی رحمت کے ذریعے سے، یا محمدؐ! میں آپ کے ذریعے سے اپنے پروردگار کی طرف رُخ کرتا ہوں کہ میری یہ حاجت پوری ہو۔ اس کے بعد اپنی حاجت کا اظہار کرنا، چنانچہ اس نے ایسا کیا اور پھر جناب

عثمان بن عفان کے دروازے پر گیا تو دربان آیا اور وہ اُسے عثمان کے پاس لے گیا۔ انھوں نے اُس کو اعزاز کے ساتھ بٹھایا اور کہا بتاؤ! تمھاری کیا ضرورت ہے؟ اور اس ضرورت کو پورا کر دیا۔

(۱۴)

پیغمبرؐ کے وسیلے سے طلبِ شفا

صحیح مسلم میں اسماء بنت ابی بکر سے روایت ہے کہ اُنھوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا جبّہ نکال کر دکھایا اور کہا یہ عائشہ کے پاس تھا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اسے پہنتے تھے اب ہم اسے دھو کر مریضوں کو پانی پلاتے ہیں اور اس کے ذریعے سے شفا حاصل کرتے ہیں۔ اسے وہابی جماعت کے مقتدا ابن قیّم نے بھی اپنی کتاب "زاد المعاد" میں درج کیا ہے۔

(۱۵)

عبداللہ بن زبیر کا توسّل

ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں شعبی کی روایت درج کی ہے کہ میں نے ایک عجیب واقعہ دیکھا۔ ہم لوگ صحن کعبہ میں بیٹھے تھے۔ میں اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر اور مصعب بن زبیر اور عبدالملک بن مروان۔ نماز کے بعد سب لوگوں نے کہا کہ ایک شخص تم میں سے اٹھے اور رکن یمانی کی طرف جائے اور اُسے پکڑ کے خدا سے دعا کرے۔ اپنی حاجت طلب کرے تو وہ ضرور پوری ہوگی اور پھر سب نے کہا کہ تم اے عبداللہ بن زبیر اٹھو کہ تم ہجرت کے بعد سب سے پہلے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے شخص ہو۔ اس پر وہ اٹھے اور انھوں نے رکن یمانی کو پکڑ کر کہا:

"خداوندا! تو بزرگ ہے۔ ہر بڑی سے بڑی بات کے لیے تجھ ہی سے امید وابستہ کی جاسکتی ہے۔ میں تجھ ہی سے سوال کرتا ہوں تیرے عرش کی حرمت کے واسطے سے اور تیرے چہرے کی حرمت کے واسطے سے اور تیرے پیغمبر کی حرمت کے واسطے سے کہ تو مجھے دنیا سے نہ اُٹھانا، یہاں تک کہ میں حجاز کا حکمراں ہوں اور مجھے خلیفہ کہہ کر سلام کیا جائے۔"

مذکورہ بالا توسّل کے شواہد میں کچھ تو حضرتؐ کی وفات کے بعد سے متعلق ہیں۔ لہذا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ زندگی میں حضرتؐ کے وسیلے سے دعا میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بعد وفات نہیں ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک تو اصولاً جو شے شرک میں داخل ہو اس میں کسی کی حیات اور موت کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا اور پھر یہ رسولؐ کی وفات حقیقۃً وہ سی موت نہیں جو عام اموات کی ہوتی ہے بلکہ آپؐ اس ظاہری موت کے بعد بھی حقیقۃً سنتے اور جواب دیتے ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے مگر مجملاً اتنا عرض ہے کہ حیات شہدا بنص قرآن ثابت ہے۔ اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ پیش خدا حقیقۃً دوسرے شہدا سے بدرجہا بالاتر ہے اور ابو درداء کی روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ روز جمعہ مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو کہ اس دن فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور کوئی شخص مجھ پر کبھی درود نہیں بھیجے گا مگر یہ کہ وہ اس کا درود میرے سامنے پیش ہوگا (راوی کہتا ہے) میں نے کہا کہ آپ کی وفات کے بعد بھی؟ فرمایا ہاں میری وفات کے بعد بھی۔ یقیناً اللہ نے زمین پر حرام کیا ہے کہ وہ پیغمبروں کے جسم کو کھائے اور پیغمبر زندہ رہتا ہے۔ اُسے رزق عطا ہوتا ہے۔
حافظ ابن ماجہ نے اپنے سنن میں اس کی روایت کی ہے اور اس مضمون کی

کئی حدیثیں ہیں جو خصائص کبریٰ سیوطی میں اور دلائل النبوۃ حافظ ابونعیم اصفہانی میں آئی ہیں۔ اور محدث سندی نے اپنے حاشیے میں جو سنن ابن ماجہ پر ہے، اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ اس میں شک نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ بات شہداء کے بارے میں تو قرآن میں آئی ہے تو پھر پیغمبروں کا کیا ذکر؟ اور خاص حیات انبیاء کے بارے میں بھی کچھ حدیثیں موجود ہیں، ان میں سے یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے جناب موسیٰؑ کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔

اب جبکہ حیاتِ رسولؐ ثابت ہوگئی تو آپ کی اس زندگی میں جو توسّل کی حدیثیں ہیں، وہ سب اس وقت بھی توسّل کے صحیح ہونے کی دلیل ہیں۔

قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ حضرتؐ کی زندگی میں اور نیز وفات کے بعد حضرتؐ سے توسّل کے شواہد اتنے زیادہ ہیں کہ اُن کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔

محدثین سلف حضرتؐ کی قبر مطہر پر جاکر دعا کو قابل اعتراض نہیں سمجھتے تھے چنانچہ علامہ شمس الدین جزری نے "حصن حصین" میں بہت اچھے الفاظ لکھے ہیں کہ:

"اگر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر پر دعا قبول نہ ہو تو اور کہاں مقبول ہوگی؟"

اور شاہ عبدالحق دہلوی نے اپنی کتاب "جذب القلوب" میں لکھا ہے کہ مقاصد کے حصول اور عجیب و غریب فائدوں کے مرتب ہونے میں جو واقعات حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر شریف پر فریاد اور طلب حاجت سے محتاجوں اور غریبوں کے سامنے آئے ہیں، بکثرت ہیں۔

قاضی عیاض نے شفاء میں امام مالک کا مکالمہ خلیفہ عباسی ابوجعفر منصور دوانیقی کے ساتھ درج کیا ہے کہ خلیفہ نے اُن سے پوچھا کہ میں قبلہ کی طرف رُخ کروں یا چہرہ مبارک کی طرف رُخ کرکے کھڑا ہوں؟ امام مالک نے کہا کہ آپ حضرتؐ کی طرف سے

مُنھ کیونکر موڑے گا جبکہ وہ آپ کے بھی وسیلہ ہیں اللہ کی طرف سے اور آپ کے باپ ابوالبشر حضرت آدمؑ کے بھی۔

ہمارے فاضل ہمعصر سید ابراہیم راوی رفاعی نے "اوراقِ بغدادیہ" میں ربلی سے نقل کیا ہے، انھوں نے آدابِ زیارت میں لکھا ہے کہ پھر قبر شریف پر آئے حضرتؐ کے سرِ مبارک کی طرف رخ اور قبلہ کی طرف پشت کیے ہوئے اور چار ہاتھ کے قریب کی دوری پر کھڑا ہو اور جدھر رخ ہو، اُس کے نیچے کے حصے پر نظر رکھے اور سلام پیش کرے کیونکہ حدیث ہے کہ جو مجھے سلام کرے گا میں اس کا جواب دوں گا۔ اور سلام میں آواز بلند نہ کرے جیسے حضرتؐ کی زندگی میں حکم تھا۔ پھر آخر میں حضرتؐ کے چہرۂ مبارک کی طرف آکر حضرتؐ سے توسّل کرے اور آپ سے پروردگار کی بارگاہ میں شفاعت کا خواہاں ہو۔

گزشتہ شواہد میں سے بعض سے ثابت ہوجاتا ہے کہ حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نسبت رکھنے والی ہر چیز سے برکت حاصل کرنا صحابہ و تابعین اور سلف صالحین کے نزدیک مسلّم رہا ہے۔

عبداللہ بن عمر کی نسبت بیان ہے کہ وہ آثارِ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جستجو میں پھرتے تھے اور جہاں حضرتؐ نے نماز پڑھی ہو، چاہے عمر میں ایک دفعہ، وہاں جاکر نماز پڑھتے تھے اور انہی جگہوں پر پھر مسجدوں کی تعمیر ہوئی۔ اس کا سمہودی نے "وفاء" میں ذکر کیا ہے۔

ابن القیم نے اپنی کتاب "زاد المعاد" میں جناب اسمٰعیل اور ہاجرہ کے ذکر میں حتمی طور پر لکھا ہے کہ "ابراہیمؑ اور اُن کے فرزند اسمٰعیل کا وطن سے دور ہونا اور تنہائی اور قربانی کے لیے آمادگی، اس سب کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے آثار اور ان کے قدموں کے نشانات محلِ عبادت بن گئے مومنین کے لیے اور مناسکِ حج میں داخل ہوگئے قیامت تک کے لیے۔" اب جب جناب اسمٰعیل اور ہاجرہ کے آثار اس وجہ سے کہ انھوں نے

راہِ خدا میں ایذائیں اٹھائیں۔ اس کے مستحق ہوئے کہ وہ محلِ عبادت بن جائیں۔ تو جو ذات تمام انبیاء میں افضل ہو اور جس کا ارشاد ہو کہ کسی نبی کو وہ ایذائیں نہیں پہونچیں جو ایذائیں مجھے پہونچی ہیں آپؐ کے آثار کیا اس کے مستحق نہیں ہوں گے کہ اُن کی تعظیم و تکریم کی جائے؟ اور یہ کلیہ ہے کہ کسی بلند ذات کی طرف نسبت سے دوسری چیز میں عظمت پیدا ہوجاتی ہے چنانچہ خصائص کبریٰ سیوطی میں معراج کے حال میں پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ہے کہ:

"میں چلا اور میرے ساتھ جبرئیل تھے۔ ایک جگہ پہونچ کر انھوں نے کہا سواری سے اتریے اور یہاں نماز پڑھیے۔ میں نے ایسا کیا تو انھوں نے کہا آپ جانتے ہیں؟ آپ نے کہاں نماز پڑھی؟ یہ طیبہ ہے جہاں آپ ہجرت کرکے جائیں گے۔ اس کے بعد میں چلا تو پھر انھوں نے کہا اتریے۔ یہاں نماز پڑھیے۔ یہ طورِ سینا ہے جہاں اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا۔ پھر میں چلا، اور انھوں نے کہا اتریے۔ نماز پڑھیے۔ یہ بیت لحم ہے جہاں عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔"

اب ہر صاحبِ ضمیر فیصلہ کرسکتا ہے کہ عیسیٰؑ کی ولادت کا مقام اس لائق ہو کہ وہاں نماز پڑھی جائے تو کیا حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکانِ ولادت اس کا مستحق تھا کہ وہ منہدم کردیا جائے جیسا کہ وہابیوں نے کیا؟

اس کے علاوہ حضرتؐ کی تعظیم و تکریم اور حضرتؐ کی طرف نسبت رکھنے والی چیزوں کا احترام و اکرام اور ان کو متبرک سمجھنا، اس کے بکثرت شواہد آثارِ صحابہ و سلف صالحین میں موجود ہیں۔

ابوعمرو شیبانی کی روایت ہے کہ میں ابن مسعود کے پاس ایک سال اُٹھتا بیٹھتا رہا جس وقت وہ قال رسول اللہ کہتے تھے، ان کے جسم میں تھرتھری پڑجاتی تھی۔

شیخ بدرالدین بن ابراہیم بن سعد اللہ ابن جماعہ کنانی متوفی ۷۳۳ھ کی کتاب

"تذکرۃ السامع والمتکلم" (مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۵۳ھ) میں ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؑ کے سامنے جب حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہوتا تھا تو آپ کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا۔

اسی کتاب میں امام مالک کے لیے لکھا ہے کہ جب حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُن کے سامنے ذکر ہوتا تھا تو ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا اور وہ جھک جاتے تھے۔

عبدالکریم سمعانی کی کتاب "ادب الاملاء والاستملاء" (مطبوعہ برلن ۱۹۵۲ء) میں یحییٰ بن بکیر سے روایت ہے جب مؤطا (مجموعہ احادیث پیغمبرؐ) کی حدیثوں کا پڑھ پڑھ کر مالک مقابلہ کراتے تھے تو پورا لباس عمامے کے ساتھ پہنتے تھے اور سر جھکائے رہتے تھے اور جب تک ان احادیث کو لکھوا کر فارغ نہیں ہوتے تھے سر وغیرہ کو کھجاتے بھی نہیں تھے، نہ ناک چھنکتے تھے۔ یہ کیفیت اُن کی ارشادات پیغمبرؐ کی تعظیم و تکریم کے لحاظ سے ہوتی تھی۔

اسی کتاب میں معن بن عیسیٰ دزّاق کا بیان ہے کہ مالک جب احادیث بیان کرنے بیٹھتے تھے تو غسل کرتے تھے اور خوشبو لگاتے تھے۔ حاضرینِ مجلس میں سے کوئی آواز بلند کرتا تو خفا ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ خالق نے ارشاد فرمایا ہے کہ پیغمبرؐ کی آواز پر آواز بلند نہ کرو۔ آج رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان ہوتے وقت کوئی آواز بلند کرے تو وہ ایسا ہوگا جیسے کہ اُس نے آپؐ کی آواز پر آواز بلند کی۔

علاوہ دوسرے حضرات کے نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے بھی لکھا ہے کہ:-

"امام مالک مدینے میں پیادہ چلتے تھے کہ شاید اُن کے جسم سے خاک کا کوئی وہ جزو متصل ہو جائے جس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راستہ چلے ہیں اور حضرتؐ کی تعظیم کے سبب وہ مدینے میں سوار ہو کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں سواری پر چلوں اس خاک کے اوپر جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دفن ہیں۔

تعظیم کی ایک قسم یعنی بوسہ لینا۔ اس کے خلاف وہابی مسلک کے حضرات بہت تشدد سے کام لیتے ہیں۔ مگر اس کے لیے خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رضامندانہ سکوت ہی نہیں بلکہ صریحی اجازت بھی موجود ہے اور آپ کے بعد سلف صالحین کا عمل بھی جاری ہے۔ چنانچہ "ادب الاملاء والاستملاء" میں عبدالرحمٰن بن کعب بن مالک کی روایت ہے اپنے والد سے کہ میں حضرت کی خدمت میں آیا تو حضرتؐ کے ہاتھوں اور دونوں گھٹنوں کا بوسہ لیا اور شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب "محاضرۃ الابرار" میں ابن بُریدہ کی روایت ہے اپنے والد سے کہ ایک اعرابی رسولؐ کے پاس آیا اور ایک معجزے کی خواہش کی۔ اُس معجزے کے دیکھنے کے بعد کہا یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے ہاتھوں اور پیروں کا بوسہ لوں۔ آپؐ نے اس کی اجازت دے دی۔ پھر اس نے کہا کہ اب مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کو سجدہ کرلوں۔ حضرتؐ نے فرمایا نہیں۔ کسی کو کسی کا سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔

بوسہ بنظر تعظیم بھی ہوتا ہے اور بنظر محبت بھی۔ بہرحال اس کو شرک کہنا یا ممنوع قرار دینا، دونوں غلط ہیں۔

اصابہ حافظ ابن حجر میں ہے کہ خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عثمان بن مظعون رضوان اللہ علیہ کی لاش کا بوسہ لیا اور اس وقت آپؐ کی آنکھیں گریاں تھیں۔

بعد وفات پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجرۂ نبویہ اور روضۂ مقدسہ اور دوسرے منسوبات کو بھی بوسہ لینے پر مسلمانوں کا عمل رہا اور علماء اس سے متفق رہے۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل کے ایک مصاحب خاص ابراہیم حربی کے لیے شیخ منصور حنبلی نے حاشیہ اقناع میں لکھا ہے کہ انھوں نے کہا "حجرۂ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بوسہ لینا مستحب ہے۔"

مہدی عباسی کے پاس ایک شخص نعلین لایا اس ادّعا کے ساتھ کہ یہ رسول خدا

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پائے مبارک تک پہونچی ہے اور حضرتؐ کی پہنی ہوئی ہے، تو باوجودیکہ خود بعد میں کہا مجھے یقین ہے کہ یہ شخص غلط کہتا ہے۔ رسولؐ کے پائے مبارک سے یہ نعل چھو بھی نہیں گئی ہے، پھر بھی اس لیے کھڑے ہو کر بوسہ لیا آنکھوں سے لگایا کہ عام مسلمان مجھ پر بے ادبی کا الزام لگائیں گے کہ میرے پاس رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعلین لائی گئی اور میں نے اُس کی تعظیم و تکریم نہیں کی۔ یہ واقعہ شیخ ابن عربی نے "محاضرۃ الابرار" میں درج کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ منسوبات پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم جمہور ملت اسلامیہ کے دل و دماغ میں مرتکز تھی۔

تعظیم و تکریم اور تحصیل برکت ہی کی ایک صورت مس کرنا بھی ہے، خواہ اپنے ہاتھ کو رسولؐ کے جسم مبارک تک پہونچا کر یا آپؐ سے خواہش کرنا کہ آپ اس پر ہاتھ پھیر دیجئے۔ ان دونوں باتوں کا وقوع رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت اور خود آپؐ کے عمل سے ثابت ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ میں لکھا ہے کہ بنی بکار کا وفد حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ ان میں معاویہ بن ثور بن عبادہ بحیثیت سردار کے تھے۔ جن کی ایک سو برس کی عمر تھی۔ یہ سب مسلمان ہوئے اور رخصت ہوتے وقت معاویہ نے حضرتؐ سے خواہش ظاہر کی کہ میں آپ کے جسم مبارک کو اپنے ہاتھ سے مس کر کے برکت حاصل کرنا چاہتا ہوں حضرتؐ نے اس کی اجازت دی۔ پھر انھوں نے کہا میرا یہ بیٹا بشر بڑا سعادت مند ہے، اس کے چہرے پر آپ ہاتھ پھیر دیجئے۔ حضرتؐ نے اُس کے چہرے پر ہاتھ پھیر دیا۔

حضرتؐ کے موہائے مبارک کی تقسیم کے لیے صحاح اہل سنت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود حضرتؐ کے حکم سے ہوئی تھی۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرتؐ نے ابوطلحہ انصاری سے جنھوں نے سر مبارک سے بالوں کو صاف کیا تھا فرمایا کہ انھیں لوگوں میں تقسیم کر:

"محاضرۃ الاوائل" میں ہے کہ ان بالوں کو ابوطلحہ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے تقسیم کیا اور آپؐ کے موہائے مبارک اس لیے تقسیم کیے گئے کہ وہ صحابہ کے پاس برکت کے لیے باقی رہیں۔

"جمع بین الصحیحین" میں عبداللہ بن موہب کی روایت ہے کہ میرے گھر والوں نے مجھے زوجۂ رسولؐ جناب ام سلمہؓ کے پاس پانی کے ایک پیالے کے ساتھ بھیجا۔ وہ چاندی کا ایک ظرف لائیں جس میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ موہائے شریف تھے۔ اُن میں سے کچھ بال انھوں نے اس پیالے میں ڈال دئے۔ اور جب کوئی بیمار ہوتا تھا تو وہ اُسی ظرف سے نکال کر کچھ بال ڈال دیتی تھیں۔ اور وہ بیمار اس پانی کو پیتا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے جھک کر اُس برتن میں دیکھا تو کچھ سُرخ رنگ کے بال تھے۔

قاضی عیاض نے **شفاء** میں حضرتؐ کے معجزات و برکات میں لکھا ہے کہ حضرتؐ کے موہائے مبارک میں سے چند بال خالد بن ولید کی ٹوپی میں تھے جن کی وجہ سے وہ ہر جنگ میں فتح پاتے تھے۔

بخاری کی روایت ابن سیرین سے ہے کہ انھوں نے عبیدہ سے کہا کہ ہمارے پاس کچھ موہائے مبارک ہیں جو ہمیں انسؓ یا اُن کے گھر والوں سے ملے ہیں۔ انھوں نے کہا ارے اُن میں سے ایک بال میرے پاس ہو تو وہ میرے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔

اسی طرح جو شے ذرا بھی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلق رکھتی ہو اُسے ہمیشہ متبرک و مقدس سمجھا گیا چنانچہ شفائے قاضی عیاض میں ہے کہ عبداللہ بن عمر منبر رسولؐ کے اُس محل پر جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما ہوتے تھے، ہاتھ رکھتے تھے، اور اُسے تبرکاً اپنے منھ پر ملتے تھے۔

اصابہ حافظ ابن حجر میں ہے کہ یزید بن اسود کے جب احتضار کا وقت تھا تو صحابی رسولؐ واثلہ بن اسقع اُن کے پاس آئے تو انھوں نے ان کا ہاتھ لے کر اپنے منھ پر ملا اور

سینے پر رکھا اور کہا کہ یہ وہ ہاتھ ہے جو رسولؐ کے دستِ مبارک سے مس ہوا ہے۔

مسند احمد میں ام سلیم سے روایت ہے کہ حضرتؐ نے ایک مشک سے جو اُن کے یہاں بھی پانی نوش فرمایا تھا تو اس مشک کا دہانہ جو حضرتؐ کے دہن مبارک سے مس ہوا تھا جدا کر کے حصول برکت کے لیے رکھ لیا گیا، اور ایسا ہی واقعہ ابن ماجہ اور ترمذی نے کبشہ انصاریہ کے متعلق درج کیا ہے اور ترمذی نے حسن صحیح لکھا ہے۔

جمع بین الصحیحین میں سہل بن سعد صحابی کے متعلق روایت ہے کہ انھوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک چادر آپ کی مانگ کر حاصل کی اور جب لوگوں نے اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ میں نے اسے اس لیے حاصل کیا ہے کہ وہ میرا کفن ہو اور اس طرح میں عذاب قبر سے محفوظ رہوں۔

شفائے قاضی عیاض میں ہے کہ صحابۂ پیغمبر خداؐ آپ کے آثار مبارکہ کو آپؐ کے بعد بڑی بڑی قیمتوں پر حاصل کرتے تھے۔

سر دست اتنے شواہد پیش کر دیے گئے ہیں جو اثباتِ مطلب کے لیے کافی و وافی ہیں۔

باوجودیکہ وہابی حضرات اپنے کو اہل سنت میں داخل کرتے ہیں اور اُن کے ہم خیال جو ہندوستان میں ہیں، وہ اکثر اپنے کو "اہل حدیث" کہتے ہیں مگر ان کا مسلک جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے توسل کی مخالفت اور آپؐ کے آثار و منسوبات کی تعظیم و تکریم کے خلاف ہے، سنت کے بھی خلاف اور حدیث کی رو سے بھی غلط ہے۔

تشیر ابواب

وہابی عقیدہ اولیاء وصالحین کے بارے میں

ابن عبدالوہاب کو اُن کی بزرگی اور کسی امتیاز سے شدّت کے ساتھ انکار ہے، اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ان میں سے کسی سے بھی توسل اور خالق کی بارگاہ میں شفاعت کی درخواست انھیں خدا سمجھ لینا ہے اور عبادت میں اُس کے ساتھ دوسرے کو شریک کرنا ہے۔ اُسے انھوں نے اور اُن کے تابعین نے بڑے طول طویل بیانات کے ساتھ تحریر کیا ہے جن میں بعض عبارتوں کا مضمون اُن کے نقطۂ نظر کے پورے طور سے نمایاں کرنے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ پھر اُن کے مندرجات کو ایک ایک کر کے باطل کیا جائے گا۔

خود ابن عبدالوہاب نے اپنی کتاب "التوحید" میں اُن آیات قرآن کے درج کرنے کے بعد جو توحید کے بارے میں اور دوسرے خداؤں کی عبادت کرنے والے مشرکین کی رد میں لکھا ہے:

" یہ شرک جو ان آیتوں میں اور ایسی ہی دوسری آیتوں میں مقصود ہے، اس میں داخل ہے قبروں کے پوجنے والوں اور انبیاء اور ملائکہ اور نیک بندگان الٰہی کی عبادت کرنے والوں کا شرک، یہی عرب کے اہل جاہلیت کا شرک تھا جس کے ختم کرنے کے لیے حضرت محمد مصطفےٰ کی بعثت ہوئی تھی کہ وہ اُن سے دعائیں مانگتے تھے اور ان کی طرف پناہ لیتے تھے اور

اُن سے سوال کرتے تھے، خدا کے یہاں ان کے تقرب کو اپنا وسیلہ قرار دیتے تھے جیسا کہ قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں اس کا ذکر ہے۔ حالانکہ وہ انھیں آسمان، زمین یا کسی ایک ذرّے کا بھی کائنات میں سے خالق نہیں سمجھتے تھے۔ مگر چونکہ ان کی عبادت کرتے تھے لہٰذا وہ مشرک قرار پائے تو اسی طرح یہ لوگ جو اولیاء و صالحین کا واسطہ دیتے ہیں اور اُن سے دعائیں مانگتے ہیں۔"

اس میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ زیارتِ قبور کرنے والوں اور اولیاء و مقربین کی تعظیم و تکریم کرنے والوں کی، اُن کی عبادت کرنے والوں کی نقطۂ سے تعبیر کی گئی ہے۔ اس کے لیے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ عبادت کے کیا معنی ہیں؟

"عبادت" درحقیقت کسی خاص کام کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ کام ہے جو کسی کو خدا سمجھنے کی نیت سے اور اس نیت کے تقاضے سے کیا جائے۔ اسی لیے اولاد کا اپنے ماں باپ کے سامنے جھکنا اور جاہل کا عالم کے سامنے جھکنا۔ ایک اُمتی کا سادات کے سامنے جھکنا، کسی بھی چھوٹے کا اپنے بڑے کے سامنے جھکنا عبادت نہیں ہے لیکن مجوسیوں کا آگ کے سامنے جھکنا اور بت پرستوں کا بتوں کے سامنے جھکنا عبادت ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرک کسی کام کی نوعیت سے وابستہ نہیں بلکہ اعتقادِ الوہیت سے وابستہ ہے۔ ہوسکتا ہے کسی کو سجدہ کیا جائے مگر وہ عبادت اس کی قرار نہ پائے اور ہوسکتا ہے کہ صرف آنکھ کا اشارہ ہو اور وہ عبادت کا مصداق ہو۔

مشرکین چونکہ اپنے بتوں کو خدا سمجھتے تھے لہٰذا کہتے تھے کہ ہم ان کی عبادت کرتے ہیں۔ (ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ) لیکن مسلمان جو رسولؐ یا کسی تقربِ الٰہی کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں، ان سے پوچھا جائے تو وہ کہیں گے کہ ہم ان کی

عبادت نہیں کرتے۔ عبادت اللہ کی کرتے ہیں۔ ہاں ہم ان کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ یہیں سے اُن مسلمانوں میں اور اُن مشرکین میں فرق ظاہر ہے۔

اس طرح کی تعظیم و تکریم شرک نہیں ہوسکتی جبکہ والدین کے لیے خالق نے خود حکم دیا کہ: "ان کے سامنے اپنے کو تذلّل و عاجزی کے ساتھ جھکائے رہا کرو۔" یہ تعظیم کا حکم نہیں تو اور کیا ہے؟

اور ارشاد فرمایا کہ:

"جو شعائرُ اللہ کی تعظیم کرے تو یہ تقویٰ و پرہیزگاری کا ایک جزو ہے۔"

اور اس طرح اللہ کی حرمتوں کی تعظیم کے لیے فرمایا اور حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حکم دیا کہ:

"اپنے بازو جھکائیے اس کے لیے جو مومنین میں سے آپ کا پورا متبع ہو۔"

سب سے بالاتر یہ کہ حق تعالیٰ نے ملائیکہ مقربین کو حکم دیا کہ وہ ابوالبشر جناب آدمؑ کو سجدہ کریں اور ابلیس کو سجدہ نہ کرنے پر مطرود و مردود قرار دیا اور سورۂ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور چاند اور سورج انھیں سجدہ کر رہے ہیں اور پھر اُس کی تعبیر یوں وقوع میں آئی کہ انھوں نے اپنے باپ کو جو نبیِ خدا حضرت یعقوبؑ تھے اور اپنی والدہ کو بلند تخت پر بٹھایا تو ان دونوں نے اور تمام بھائیوں نے جو گیارہ تھے، انھیں سجدہ کیا۔

شریعتِ اسلام میں اللہ کے سوا کسی کے لیے سجدے کا روا نہ ہونا ایک حکمِ شرعی ہے۔ لیکن سابق شریعتوں میں اس کا جائز ہونا اور وقوع میں آنا اس کی تو دلیلِ قطعی ہے کہ وہ شرک نہیں ہے کیونکہ اصولِ دین میں تمام انبیاء متحد ہیں۔ جو شے داخلِ شرک ہو، وہ کسی بھی شریعت میں جائز نہیں ہوسکتی۔

اس سب سے یہ امر پایۂ ثبوت تک قطعی طور پر پہونچ جاتا ہے کہ ہر تعظیم عبادت

نہیں ہے۔ عبادت کی بنیاد خدا سمجھنے پر ہے اور جو مسلمان انبیاء و اولیاء و مقربین کی تعظیم کرتے ہیں، ان کے ذہن میں ہرگز ان کے خدا ہونے کا تصور نہیں ہوتا بلکہ وہ یقینی طور پر صدق دل سے جانتے ہیں کہ یہ اللہ کے بندے ہیں جنھوں نے اپنی پوری عمر اس کی عبادت اور اطاعت میں صرف کی ہے اور اس کی راہ میں انھوں نے قربانیاں دی ہیں، اسی لیے وہ ہماری تعظیم و تکریم کے مستحق ہیں تو یہ تعظیم درحقیقت اللہ کی تعظیم ہے جو عین توحید ہے اور یہ تعظیم غیر اللہ کی جو اللہ کی طرف نسبت خاص کے پیش نظر ہے، تعظیم ان افراد کی ہے لیکن وہ عبادت ان کی نہیں ہے بلکہ اس کی عبادت ہے جس کی طرف انتساب سے ان کی تعظیم ہو رہی ہے۔

اور دعاء، وہ براہ راست ان سے نہیں ہوتی کہ ہم انھیں اپنی حاجت براری کے لیے خدا سے بے نیاز ہو کر کافی سمجھتے ہوں بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ جو بارگاہ الٰہی میں اس کی اطاعت و عبادت کی وجہ سے قرب حاصل کیے ہوئے ہیں، ہمارے لیے اس کی بارگاہ میں حاجت براری کے لیے دعا کریں اور یہ عام مومنین کے لیے آپس میں وارد ہوا ہے کہ ایک کی دعا دوسرے کے بارے میں بسا اوقات مستجاب ہوتی ہے اور چونکہ ہم انھیں زندہ سمجھتے ہیں جیسا کہ شہداء کے بارے میں صراحۃً قرآن میں ہے تو ہم ان سے مخاطب ہو کر بھی مدد کے لیے جو کہتے ہیں، اس کا بھی مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے لیے عرض معروض کریں یا رضی باری کے ماتحت اس کے اذن سے خود مدد کر دیں اور اس طرح اللہ کے فعل کی نسبت غیر اللہ کی طرف قرآن مجید سے ثابت ہے جیسے وفات کا دینا اللہ کا کام ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ نفوس کو وفات دیتا ہے ان کی موت کے وقت اور دوسری جگہ اس کی نسبت ملک الموت کی طرف ہے۔ ارشاد ہوا ہے: کہیے کہ تمھیں وفات دیتا ہے موت کا فرشتہ اور تیسری جگہ اس کی نسبت ان فرشتوں کی طرف دی گئی ہے جو ملک الموت کے ماتحت ہیں،

ارشاد ہوا کہ وہ جنھیں فرشتے وفات دیتے ہیں درانحالیکہ وہ اپنے نفوس پر ستم ڈھانے والے ہیں، اسی طرح عطائے رزق یا اولاد کی نسبت کسی کی طرف ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، جبکہ کہنے والا عقیدہ یہی رکھتا ہو کہ اصل عطا کرنے والا خداوند عالم ہے اور یہ اگر عطا کریں گے تو اس کے حکم سے یا خود اس کی بارگاہ میں سفارش کے ذریعے سے۔

سنن ابوداؤد میں جبیر بن مطعم کی روایت ہے کہ ایک اعرابی نے حضرتؐ کے پاس آ کر قحط سالی کا حال بیان کیا اور مقصود اس کا یہ تھا کہ حضرتؐ طلب باراں فرمائیں مگر اس نے یہ کہا کہ ہم اللہ سے سفارش کراتے ہیں آپ کے یہاں اور آپ کی شفاعت چاہتے ہیں اللہ کی بارگاہ میں۔ پہلے جملے پر حضرتؐ نے کئی دفعہ تسبیح الٰہی فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس کی ذات برتر ہے اس سے کہ اس کو کسی کے پاس شفاعت کے لیے پیش کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ نے اس فقرے پر کہ آپ بارگاہ الٰہی میں سفارش کیجیے، کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔

ہاں جو شخص ان حضرات کو اللہ کا (معاذ اللہ) برابر والا سمجھے اور اللہ کے مقابلے میں انھیں حاجت روا اور کارساز مانے اسے ہم بھی مشرک سمجھتے ہیں۔

ابن عبدالوہاب کا قول ہے کہ

"جو کچھ مسلمانوں کا اولیاء و صالحین کے ساتھ عمل ہے یہی بس مشرکین عرب کا عمل تھا۔"

یہ از روئے قرآن درست نہیں ہے کیونکہ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ وہ اپنے اصنام کو "آلہہ" کہتے تھے یعنی خدا سمجھتے تھے اور اسی لیے وہ خدا کی عبادت سے اپنے کو بے نیاز سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن میں ہے کہ "انھوں نے پیغمبر کے لیے کہا کہ یہ ہمیں ہمارے خداؤں سے گمراہ کیے دیتا ہے۔"

سورۂ صافات میں ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایک دیوانے شاعر کی خاطر اپنے

خداؤں کو چھوڑ دیں؟"

سورۂ صٓ میں ہے کہ اُن کی زبانی رسول کے لیے کہ اس نے بہت سے خداؤں کو ایک خدا بنا دیا۔ یہ عجیب بات ہے۔"

سورۂ شعراء میں ہے اہل دوزخ کی زبانی کہ "وہ اپنے معبودوں سے کہیں گے کہ ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے کہ تمھیں پروردگار عالمیان کے برابر قرار دیتے تھے۔" اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر قرار دیتے تھے۔

سورۂ احقاف میں ہے کہ انھوں نے کہا "تم آئے ہو کہ ہمیں ہمارے خداؤں سے ہٹاؤ۔"

سورۂ نوح میں ہے کہ "وہ مشرکین کہتے ہیں کہ اپنے خداؤں کو کبھی نہ چھوڑنا، وَدّ کو، سواع کو، یغوث اور یعوق اور نسر کو" (یہ سب اُن کے بتوں کے نام ہیں جنھیں وہ صاف صاف خدا کہہ رہے ہیں)

سورۂ ہود میں ہے کہ "ہم ہرگز ان خداؤں کو نہیں چھوڑیں گے۔"

پھر ہے کہ "ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے خداؤں میں سے کسی نے تمھیں کچھ نقصان پہونچا دیا ہے۔" ——— اور خود خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ

"نہیں فائدہ پہونچایا انھیں اُن کے خداؤں نے جنھیں وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے کچھ بھی۔"

اور سورۂ حجر میں ہے کہ "ہم نے آپ کو بچایا اُن مذاق اڑانے والوں سے جو اللہ کے سوا دوسرا خدا بناتے ہیں۔"

اور سورۂ بنی اسرائیل میں ہے کہ "اگر اُس کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو اس وقت وہ عرش کے مالک کے مقابلے میں کوئی صورت نکال لیتے۔"

اور سورۂ مریم میں ارشاد ہوا ہے کہ "ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر بہت سے خدا

بنا لیے ہیں تاکہ وہ اُن کے لیے باعث غلبہ ہوں، ہرگز نہیں، بہت جلد وہ اُن کی عبادت سے انکار کریں گے اور خود اُن کے فریق مخالف ہوں گے۔"

اور سورۂ انبیاء میں ان کی زبانی ارشاد ہوا ہے کہ "کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے؟"

پھر ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے بتوں کو توڑ ڈالا

"انھوں نے کہا کہ کس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا؟ یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے۔"

پھر ہے

"انھوں نے (ابراہیمؑ سے) کہا کیا تم نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے اے ابراہیم؟"

پھر ارشاد ہوا ہے

"انھوں نے کہا کہ انھیں آگ میں ڈال دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔"

اور سورۂ فرقان میں ہے

"انھوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے خدا بنائے ہیں جو کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے اور وہ خود خلق کیے گئے ہیں۔"

اس سب سے ظاہر ہے کہ وہ مشرکین اپنے بتوں کو بلا تکلف 'الهه' یعنی خداؤں کی لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ اس کے برخلاف کسی مسلمان سے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا اولیاء و مقربین میں سے کسی کی تعظیم کرتا ہے پوچھا جائے کہ تم انھیں خدا سمجھتے ہو اور ان کی عبادت کرتے ہو؟ تو وہ ہرگز اس کا اقرار نہ کرے گا بلکہ شدت کے ساتھ انکار کرے گا۔ اسی سے اُن مشرکین اور اُن مسلمانوں میں فرق ظاہر ہو جاتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے یہ کہنا کہ "اُن کا روزہ نماز وغیرہ سب عوام کو دھوکا دینے کے لیے ہے اور اپنے شرک کو اسلام کے دامن میں چھپانا ہے" اس کے مقابلے میں کوئی شخص اتنے ہی بلند آہنگ کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ نجدی وہابیوں کا نماز روزہ اور حج وغیرہ سب نمائشی ہے اور اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے جبکہ وہ اُس رسولؐ کی عظمت کے منکر ہیں جن کی بدولت ان کو یہ سب باتیں یاد ہوئی ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس طرح ایک دوسرے کو کہنا کوئی علمی بحث کا انداز نہیں رکھتا اسلیے اس پر زیادہ لکھنا تضیعِ اوقات ہے۔

چوتھا باب

وہابی عقیدہ تمام اطرافِ عالم کے مسلمانوں کے بارے میں

وہابی لوگ اپنے سوا تمام دنیا کے مسلمانوں کو کافر و مشرک سمجھتے ہیں۔ آلوسی نے "تاریخِ نجد" میں ایک اہم وہابی عالم شیخ عبداللطیف بن عبدالرحمٰن ابن محمد بن عبدالوہاب نجدی کی ایک طول طویل عبارت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مسلمانانِ عالم پر اُن کے کیا الزامات ہیں جن میں سے بہت سی باتیں جھوٹ ہیں اور بعض سچ ہیں مگر ان کو غلط کہنا غلط ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ اللہ سے محبت کے بجائے غیر اللہ سے محبت کرتے ہیں حالانکہ رسولؐ اور آلِ رسولؑ یا دیگر اولیاء و مقربین سے جو لوگ محبت کرتے ہیں وہ اللہ کے مقابلے میں محبت نہیں ہے بلکہ اللہ کی خاطر ہے یا اس لیے کہ انھوں نے اُس کے دین کی خاطر کارنامے انجام دئے ہیں۔ اُس کی راہ میں قربانیاں پیش کی ہیں۔ ایسی محبت ایک فریضۂ دینی کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ذوی القربٰی کی محبت کو آیۂ مودّت میں اجرِ رسالت کہہ کے طلب کیا گیا ہے تو جس نے اس محبت سے انحراف کیا اس نے رسولؐ کا حق ادا نہیں کیا اور ایک جگہ ارشاد ہوا کہ وہ جو ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں اُن کے لیے اللہ

ایک محبت قرار دیتا ہے یعنی اس محبت کو فرض قرار دیتا ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی ہے کہ

"پروردگارا! میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو تیرے گھر کے پاس رکھا ہے۔
پروردگارا! اس لیے کہ وہ نماز قائم رکھیں تو کچھ لوگوں کے دلوں کو اُن کی
طرف جھکا دے کہ وہ اُن سے محبت کریں۔"

اور سورۂ برات میں ہے کہ

"اگر تمہارے باپ دادا، اولاد ______ وغیرہ وغیرہ خدا اور رسولؐ سے
زیادہ تمہیں محبوب ہوں تو عذاب کے منتظر رہو۔"

یہاں خدا کے ساتھ مقام محبت میں رسولؐ کا نام لیا ہے۔

انس کی روایت ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

"تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُسے اُس کے باپ بیٹے
اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔"

اس کی بخاری اور مسلم دونوں نے تخریج کی ہے اور سنن ابن ماجہ میں عباس بن عبدالمطلب سے روایت ہے کہ

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بخدا کسی کے دل میں ایمان داخل
نہیں ہو سکتا جب تک میرے اہل بیت سے محبت نہ کرے اللہ کی خاطر اور میری
قرابت کے لحاظ سے اور حضرتؐ نے حضرت علیؑ کے لیے روز خیبر فرمایا کہ میں
کل اُسے علم دوں گا جس سے خدا اور رسولؐ محبت رکھتے ہیں اور وہ خدا و رسولؐ
سے محبت رکھتا ہے۔"

اسے بھی بخاری و مسلم دونوں نے درج کیا ہے۔ نیز خود حضرت علیؑ سے خطاب کر کے فرمایا:

"اے علی! تمہاری محبت ایمان اور تم سے بغض کفر و نفاق ہے۔"

اور ایسی ہی بکثرت حدیثیں ہیں۔

اب یہ لوگ جو محبت رسولؐ وغیرہ کو اسباب شرک میں داخل کر رہے ہیں، تو بدیہی طور پر ظاہر ہے کہ ان کے دلوں میں ذرہ بھر رسولؐ اور آل رسولؐ کی محبت نہیں ہے جس کے بعد منقص رسولؐ ایمان کی دولت سے محروم ہونا ظاہر ہے۔ لیکن جو واقعی صاحب ایمان ہیں، وہ ان کی محبت کو پروردگار عالم کی طرف سے ایک فریضہ سمجھتے ہیں۔

اور ابن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کے شارح کا یہ کہنا کہ یہ ان سے اللہ سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور یہ ان کی راہ میں اتنا خرچ کرتے ہیں جس کا عشر عشیر بھی اللہ کے لیے صرف نہیں کرتے، بالکل غلط ہے بلکہ یہ ان سے محبت اللہ کی محبت کے سبب سے کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے نام پر خرچ کرتے ہیں وہ بھی اللہ کی خوشنودی کے لیے کرتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ یہ لوگ اموات کے قبور کی زیارت اور اُن کی طرف سے خیر خیرات اور توسل کی بنا پر مسلمانوں کو کافر قرار دیتے ہیں اور ان کے بہت بڑے امام فخرالدین رازی ان چیزوں کو اُن باتوں میں قرار دیتے ہیں جن پر تمام مذاہب عالم کے افراد متفق ہیں۔ اور جو عام فطرتِ انسانی کا تقاضا ہیں چنانچہ وہ تفسیر کبیر میں اس آیت کے تحت میں کہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں دریافت کرتے ہیں بقائے روح کے دلائل کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"دسویں دلیل یہ ہے کہ ہند اور روم اور عرب و عجم تمام دنیا کے اہلِ
مذاہب، یہودی ہوں یا نصرانی یا مجوسی یا مسلمان سب اپنے اموات کی
طرف سے خیر خیرات کرتے ہیں، اُن کے لیے دُعائے خیر کرتے ہیں اور اُن
کی قبروں کی زیارت کو جاتے ہیں۔ اگر یہ سب یہ نہ سمجھتے ہوتے کہ مرنے کے

بعد بھی وہ کسی نہ کسی طرح کی زندگی رکھتے ہیں تو اُن کا یہ فعل عبث ہوتا۔ ان سب کا متفق ہونا اس خیر خیرات پر اس کی دلیل ہے کہ یہ فطری طور پر بلا اختلاف یہ مانتے ہیں کہ اصل انسان اس جسم کے علاوہ کوئی جزو ہے اور وہ جزو اس جسم کے مردہ ہونے کے ساتھ مُردہ نہیں ہوگیا۔"

احادیث پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے چنانچہ صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ

"بڑا حُسن عمل یہ ہے کہ اپنی نمازوں کے ساتھ اپنے ماں باپ کے لیے نمازیں پڑھو اور اپنے روزوں کے ساتھ اپنے ماں باپ کے لیے روزے رکھو۔"

اس حدیث کے متعلق ابراہیم بن عیسیٰ طالقانی نے عبداللہ بن مبارک سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ اس حدیث کی سند میں تو نقص ہے مگر اموات کی طرف سے تصدق میں اختلاف کوئی نہیں ہے۔

"محاضرة الابرار" ابن عربی میں دو جگہ جلد اول و جلد دوم میں انس بن مالک کی روایت یہ ہے کہ:

"کسی میّت کی طرف سے جو خیرات کی جاتی ہے، اُسے نعم الٰہی کی صورت میں فرشتے لے کر اُس کی قبر کے پاس جاتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں" یہ تیرے لیے تحفہ بھیجا گیا ہے۔"

وہابی تصور کہ یہ لوگ خدا سمجھ کر محبت کرتے ہیں اور جھکتے ہیں اور امید وابستہ کرتے ہیں۔ اس میں پہلا جزو کہ وہ خدا سمجھتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ ہاں محبت کرتے ہیں جس کے متعلق تشریح ہو چکی اور یہ کہ وہ جھکتے ہیں، درست ہے لیکن یہ خداوندی نسبت کے پیش نظر رکھنے کی وجہ سے جھکنا، حقیقۃً اللہ کے لیے جھکنا ہے۔ نہ کہ ذاتاً ان اشخاص اور ان چیزوں کے لیے اور امید اللہ سے ہے، ان کے وسیلے سے، نہ کہ ذاتاً اُن سے۔

خوف و رجا یعنی ڈر اور اُمید کے بارے میں امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کی تشریح کتاب "العالم والمتعلّم" میں ہے: متعلّم کا سوال ہے کہ جو کسی سے خوف کرے یا امید وابستہ رکھے تو کیا وہ کافر ہے؟ اس کا جواب جو عالم نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ:

"رجا اور خوف یعنی امید اور ڈر کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص کسی سے امید کرے یا اس سے ڈرے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ خود اللہ کو چھوڑ کر کسی ضرر رسانی یا نفع رسانی پر قدرت رکھتا ہے تو یہ شخص کافر ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے اُمید رکھتا ہو یا کسی سے ڈر رہا ہو خیر کی اُمید یا آزمائش کے خوف کی وجہ سے اللہ کی طرف سے کہ شاید اللہ اس کے ذریعے سے مجھ تک خیر پہونچائے یا اس کے ہاتھوں مجھ پر کوئی مصیبت نازل کرے یا کسی نعمت کو سلب کرے تو ایسا شخص کافر نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ باپ بھی بیٹے سے امید رکھتا ہے کہ وہ اُسے فائدہ پہونچائے گا اور کوئی شخص اپنی سواری کے جانور سے امید رکھتا ہے کہ وہ اسے منزل تک پہونچائے گا اور اپنے ہمسائے سے امید رکھتا ہے کہ وہ اُسے فائدہ پہونچائے گا اور بادشاہ سے اُمید رکھتا ہے کہ وہ اس کی دادرسی کرے گا اور ان باتوں سے کفر لازم نہیں آتا اس لیے کہ اس کے ذہن میں یہ ہے کہ اصل مرکز نفع وضرر اللہ ہے مگر وہ شاید اس بیٹے کے ذریعہ سے میری مدد کرا دے یا اس بادشاہ کے ہاتھ سے میری دادرسی کرا دے، اس لیے ایسا شخص کافر نہیں ہے۔ اسی طرح خوف۔ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ کی زبانی ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ لوگ مجھے قتل نہ کریں، معلوم ہوا کہ اسباب ظاہری کی بنا پر کسی سے خوف بھی باعث کفر نہیں ہے۔"

یہ کہنا کہ یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر دوسروں سے دعا مانگتے ہیں تو یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ دوسروں سے ذاتاً دُعا نہیں مانگتے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ان کے لیے دعا کریں یا وہ اجازت دے تو اسکی دی ہوئی طاقت سے خود اسکی مدد کریں اس کے علاوہ ان کے وسیلے سے خداوند عالم کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہیں اور توسّل کرتے ہیں۔

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں وہابی عقیدے کے باب میں درج ہو چکے ہیں۔ کچھ مزید شواہد یہاں درج کیے جا رہے ہیں۔

سنن ابن ماجہ میں ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ:

"حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنے گھر سے نماز کے لیے نکلے یہ کہے: خداوندا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان افراد کے حق کا واسطہ دے کر جو تیری بارگاہ کے سائل ہیں اور تجھ سے سوال کرتا ہوں اپنے اس راستا طے کرنے کے حق سے جو تیری طرف ہے اس لیے کہ میں کسی نفسانیت کی وجہ سے نکلا ہوں نہ شر اور فساد کے لیے۔ نہ دکھلانے اور سنانے کے لیے۔ میں نکلا ہوں صرف تیری ناراضگی سے بچنے اور تیری خوشنودی کی طلب میں تو میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے آتش دوزخ سے پناہ میں رکھ اور میرے گناہوں کو معاف فرما کر سوا تیرے کوئی نہیں جو گناہوں کو معاف کرے۔"

اسے حافظ جلال الدین سیوطی نے جامع کبیر میں بھی درج کیا ہے۔

اور حافظ ابونعیم اصفہانی نے "عمل الیوم واللّیلۃ" میں ابوسعید خدری کی روایت درج کی ہے کہ

"حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز کے لیے برآمد ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ خداوندا! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تجھ سے سوال کرنے والوں کے حق کا واسطہ دے کر اور اپنے اس مقصد سے نکلنے کے حق کے واسطے سے کہ میں ذاتی ہوا و ہوس سے نہیں نکلا ہوں۔ نہ دکھانے اور سنانے کے لیے۔ میں نکلا ہوں تیری خوشنودی کی طلب میں اور تیری ناراضگی سے بچنے کے لیے تو میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے آتشِ دوزخ سے محفوظ اور مجھے بہشت میں داخل فرما۔"

اور سیوطی نے بھی کتاب الدعوات میں ابوسعید خدری سے اس کی روایت

کی ہے۔

بزرگوں کا عمل بھی متقدمین سے توسل پر جاری رہا چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب "خیرات حسان فی مناقب الامام ابی حنیفۃ النعمان" میں پچیسویں فصل میں درج کیا ہے کہ

"امام شافعی جب بغداد میں تھے تو امام ابوحنیفہ کی ضریح کے پاس آتے تھے، انھیں سلام کرتے تھے اور اپنی حاجت کے پورا ہونے کے لیے اُن سے توسل کرتے تھے۔"

علامہ ابن حجر مکی نے امام شافعی کے اشعار درج کیے ہیں جو انھوں نے اہلبیت رسولؐ کو مخاطب کر کے کہے تھے جن کا مضمون یہ ہے کہ:

"آلِ رسولؐ میرا ذریعہ ہیں اور وہ اس بارگاہ میں میرا وسیلہ ہیں۔ انہی کے واسطے سے مجھے اُمید ہے کہ فردائے قیامت میں میرے داہنے ہاتھ میں میرا نامۂ عمل دیا جائے گا۔"

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ توسل کی بحث میں خلیفۂ دوم عمر کا جنابِ عباس عمِ رسولؐ کو طلبِ باراں کے لیے لے جانا بیان ہو چکا ہے۔

یہاں اُس میں کچھ اضافہ کیا جاتا ہے کہ ابن اثیر جزری نے "اسد الغابہ" میں لکھا ہے کہ

"عمر بن خطاب نے قحط سالی کی شدت میں عباس کے ذریعے سے طلبِ باراں کیا اور خداوند عالم نے بارانِ رحمت نازل کیا تو عمر نے کہا بخدا یہ وسیلہ ہے اللہ کی طرف اور یہ مقام و مرتبہ ہے اُس کی بارگاہ میں اور حسان بن ثابت نے اس مضمون کے اشعار کہے کہ "جب مسلسل قحط سالی رہی تو سب نے خدا سے سوال کیا اور بادل نے عباس کے چہرے کی برکت سے سیرابی عطا کی۔ رسولؐ کے چچا

اور اُن کے والد کے بھائی اور وہ جو دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر آپ کے وارث ہیں اُنہی کے ذریعہ سے اللہ نے ان شہروں کو زندہ کیا اور وہ خشک ہونے کی حالت کے بعد تر و تازہ ہو گئے" اور جب بارش ہوئی تو لوگ عباس کے ہاتھوں کو مس کرکے اپنے منہ پر ملنے لگے اور کہتے تھے "مبارک ہو آپ کو اے حرمین کے سیراب کرنے والے" اور حافظ ابن حجر کی روایت میں ابن عباسؓ کی زبانی ہے کہ عمرؓ نے دعا میں کہا "خداوندا! ہم تجھ سے طلبِ باراں کرتے ہیں اپنے پیغمبر کے چچا کے ذریعے سے اور اُن کی سفید داڑھی کو شفاعت کے لیے پیش کرتے ہیں"

اس سے معلوم ہوگا کہ اُن کو جو نیکوکار اور پرہیزگار اشخاص اور مقربینِ الٰہی سے توسل کریں اس آیت کی زد میں لانا کہ جنھیں مشرکین پکار رہے ہیں خود اللہ کے یہاں کسی وسیلے کی فکر میں ہیں جیسے ابن عبدالوہاب نے کتاب التوحید میں درج کیا ہے اور کہا ہے "اس میں اُن مشرکین کی رد ہے جو نیک آدمیوں سے دعا کرتے ہیں اور یہ بہت بڑا شرک ہے۔" حالانکہ اس کے مقابلے میں سورۂ مائدہ میں خالق کا خود حکم موجود ہے کہ اللہ کے یہاں کے لیے وسیلہ حاصل کرو۔ اسے نظر انداز کرکے وسیلہ اختیار کرنے کو شرک قرار دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ عمر فاروقؓ کافر اور مشرک ہوں اور نیز اس قول کی وجہ سے جو انھوں نے جناب عباس رضی اللہ عنہ کے لیے کہا کہ یہ بخدا اللہ کے یہاں کے لیے وسیلہ ہے اور اس کے یہاں منزل اور مرتبہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرکین کی مذمت وسیلہ بنانے پر اس لیے ہوئی ہے کہ وہ ایسی چیزوں کو وسیلہ بنانے لگے جو توسل کے لائق نہیں ہیں یعنی بے جان پتھروں کے بُت جبکہ خداوندِ عالم نے اُن کی تعظیم اور ان سے توسل کا حکم نہیں دیا ہے۔ اس لیے بعض جگہ ہے کہ یہ ایسوں کو پکارتے ہیں جن کے لیے اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے لیکن اس کی بارگاہ میں اپنے حسنِ عمل اور اطاعت و عبادت سے

قرب حاصل کرنے والے، اُن کی تعظیم و تکریم کی خود اللہ کی طرف سے ہدایت ہے۔ لہذا اُن سے توسل شرک کیونکر ہو سکتا ہے؟ چنانچہ مسلمانوں میں ہر دور میں صالحین و مقربین کے ساتھ توسل اور اُن کے قبور پر حاضری اور دعا کو حاجت براری کا ذریعہ سمجھنا سلف صالحین میں برابر جاری رہا۔

اصابہ حافظ ابن حجر میں عبدالرحمٰن بن ربیعہ بن کعب کے ذکر میں ہے کہ انھیں خلیفۂ ثانی عمر نے باب و ابواب پر عامل بنایا اور ترکوں سے جنگ کے لیے بھیجا اور وہ وہیں ترکستان میں دفن ہوئے اور وہاں کے لوگ آج تک اُن کی قبر کے ذریعے سے طلبِ باراں کرتے ہیں۔

اور یزید بن اسود کے ذکر میں ہے کہ سلیم بن عامر کا بیان ہے: دمشق میں قحط پڑا۔ معاویہ نے یزید ابن اسود کے واسطے سے طلبِ باراں کیا، جس سے بارش ہوئی۔

شیخ ابن عربی نے محاضرۃ الابرار میں لکھا ہے کہ علی بن عمرو کاتب نے قرطبہ میں بیان کیا کہ مجھ سے ابو القاسم ابن بشکوال محدث نے یہ اشعار ابو سعید بن فاضل کے سنائے اور اُن کی قبر قرطبہ میں اسی طرح حاجتوں کے پورے ہونے میں مشہور ہے جیسے معروف کرخی کی قبر بغداد میں اور مفتی محمد رضا صاحب انصاری نے اپنی کتاب "بانیٔ درسِ نظامی" میں جو ملا نظام الدین فرنگی محلی کے حال میں تحریر کی ہے لکھا ہے کہ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے لکھا ہے:

"قبر مبارک اس وقت بھی مقصد خاص و عام اور خاص کر مریضانِ علم کے لیے نسخۂ شفا ہے۔ مشہور ہے کہ جس کو مطلب کتاب کا سمجھ میں نہ آتا ہو، کتاب کھول کر مزارِ اقدس پر حاضر رہے اور روحانیتِ حضرت سے توجہ کرے، فوراً مطلب سمجھ میں آ جائے گا۔ وھو مجرب" (تذکرہ علمائے فرنگی محل مطبوعہ ص۱۵۱)

شیعوں میں عموماً اور بعض اہل سنت کا بھی عمل ہے کہ گرنے لگتے ہیں تو "یا علی" کہتے ہیں۔ اور سنبھل جاتے ہیں۔ میں نے جیسا کہ "سفرنامۂ حج" میں لکھا ہے مجھے مدینۂ منورہ میں یہ مشاہدہ ہوا کہ چلنے میں مجھے ٹھوکر لگی اور گرنے لگا تو ایک دوکان پر سے آواز آئی "یارسول اللہ" اور میں سنبھل گیا۔

حقیقت کے لحاظ سے "یارسول اللہ" اور "یاعلی" کہنے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہابی مسلک کے لحاظ سے دونوں ہی شرک ہیں۔

اہل سنت کے ایک بڑے طبقے میں "یاشیخ عبدالقادر" کا رواج ہے۔ مفتی محمد رضا انصاری نے اسی کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ ملا نظام الدین نے کچھ لوگوں کو جو اُن کے پاس التماس دعا کے لیے حاضر ہوئے تھے کہا کہ تم میں سے جو شخص زیادہ دیندار ہو "یاشیخ عبدالقادر شیئاً للہ" کا جس قدر ممکن ہو ورد کرے۔ پھر اس پر فٹ نوٹ میں لکھا ہے:

"اس ورد کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں علماء میں اختلاف رائے ہے۔ بعض علماء اس کے پڑھنے کی ممانعت کرتے ہیں۔ کوئی سو سال پہلے اس سلسلے میں ایک صاحب نے جن علماء سے استفتار کیا تھا اُن میں مولانا رشید احمد گنگوہی دیوبندی بھی تھے۔ انھوں نے بھی کلیتہً اس ورد کو ممنوع نہیں قرار دیا ہے۔ ان علماء کے جوابات کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب کا نام ہے "فتویٰ جواز یاشیخ عبدالقادر شیئاً للہ"۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی اس کی اجازت دی ہے۔ ان کی تحریری اجازت مولانا محمد واثق الیقین سجادہ نشین کرسی ضلع بارہ بنکی اور مولانا محمد ناصر فرنگی محلی (حفید ملا نظام الدین) کے پاس میں نے خود دیکھی ہے۔"

یہ کہنا کہ یہ مسلمان قبروں پر عکوف کرتے ہیں یعنی وہاں جم کر بیٹھتے ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ

یہ جم کر بیٹھنا اگر تلاوت قرآن اور تسبیح و مناجات اور نیک اعمال کے لیے ہو یا اُن لوگوں کی مدد کے لیے جو اس قبر کی زیارت کے لیے آتے ہیں تو اس حرج کیا ہے؟ وہ کارِ خیر میں اعانت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اُن الزامات میں سے جو خوش عقیدہ مسلمانوں پر ہیں، ایک بڑی شدت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ان بارگاہوں کی چوکھٹ کا بوسہ لیتے ہیں مگر اس کے کفر و شرک ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے جبکہ تعظیم شعائر الٰہیہ کا حکم عمومی موجود ہے اور یہ بوسہ بھی اقسامِ تعظیم میں سے ہے جس کا حکم حجر اسود کے لیے موجود ہے اور اس کے علاوہ کسی چیز کو بوسہ لینے کی ممانعت نہیں ہے تو یہ تعظیم کے عمومی حکم میں داخل رہے گا اور پہلے آچکا ہے ام المومنین عائشہ کا بیان ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عثمان بن مظعون کی لاش کا بوسہ لیا اور میں نے دیکھا کہ حضرتؐ کے آنسو رخسارہائے مبارک پر جاری ہیں۔ اس کا شیخ سلیمان بلخی قندوزی نے ینابیع المودۃ میں ذکر کیا ہے اور ابن عباس اور عائشہ دونوں کی روایت ہے کہ خلیفۂ اول ابوبکر نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد آپ کی لاش کا بوسہ لیا۔ اسے ابن ماجہ نے اپنے سنن میں درج کیا ہے۔ اور قبر کا بوسہ لینے کے لیے حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حدیث کفایۂ شعبی اور فتاوائے غرائب اور مطالب المومنین اور خزانۃ الروایہ میں ہے کہ اپنے ماں باپ کی قبر کا بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایک شخص پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ یارسول اللہ! میں نے قسم کھائی ہے کہ میں بہشت کی چوکھٹ اور حورعین کی پیشانی کا بوسہ لوں گا۔ اب میں کیا کروں؟ حضرتؐ نے فرمایا کہ ماں کے پیر اور باپ کی پیشانی کا بوسہ لے لو۔ اس نے کہا کہ یارسول اللہ! اگر میرے ماں باپ زندہ نہ ہوں؟ فرمایا ان کی قبر کا بوسہ لے لو۔ اس نے کہا کہ اگر ان کی قبر معلوم نہ ہو؟ فرمایا کہ دو

لکیریں کھینچو۔ ایک ماں کی قبر کے خیال سے اور دوسری باپ کی قبر کے خیال سے ان دونوں کا بوسہ لے لو۔ تمہاری قسم پوری ہو جائے گی۔

"تمسح" کے معنی ہیں ہاتھ مس کر کے اپنے منھ پر مل لینا۔ اسے وہابی رکن یمانی کے لیے جائز و مستحسن سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے مقامات پر بھی بہ حکم تعظیم اور سیرت سلف صالحین اور عدم ثبوت منع شرعی کی بنا پر اسے جائز و مستحسن سمجھنا چاہیے۔

اور پہلے اس کتاب میں آچکا ہے کہ جب عمر نے عباس کے واسطے سے طلب باراں کیا اور بارش ہوئی تو لوگ عباس کے ساتھ تمسح کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ مبارک ہو آپ کو اے حرمین کو سیراب کرنے والے!

اور شفائے قاضی عیاض میں ہے کہ عبداللہ بن عمر کو دیکھا گیا کہ انھوں نے ہاتھ رکھا منبر کے اس محل پر جہاں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھتے تھے اور پھر اس ہاتھ کو اپنی پیشانی سے لگایا تو اگر تمسح کفر ہو تو ان تمام صحابہ و تابعین کو کافر سمجھنا پڑے گا۔

یہ کہنا کہ یہ لوگ اپنے کو ان اولیا و مقربین کا محتاج سمجھتے ہیں تو بلاشبہ ہر خدا کے بندے کے لیے لازم ہے کہ اپنے کو محتاج سمجھے اور جو اپنے کو بے نیاز سمجھ لے وہ کافر ہے جبکہ قرآن میں سورۂ احزاب میں ہے کہ

"اے انسانو! تم اللہ کی بارگاہ میں محتاج ہو اور اللہ بس ہے جو بے نیاز ہے اور قابل تعریف"

اور سورۂ محمد میں ہے کہ

"اللہ غنی ہے اور تم سب محتاج ہو"

اور اولیاء و صالحین کی طرف احتیاج اس لیے ہے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے لیے دعا کریں اور مومن دوسرے مومن کا دعائے خیر کے لیے محتاج ہے چہ جائیکہ اولیاء و مقربین اور انبیاء و مرسلین اور ائمہ طاہرین کی طرف۔

یہ کہنا کہ "ان کے ذریعے سے بارش طلب کرتے ہیں تو اس کے متعلق شواہد پہلے آچکے ہیں کہ مدینے میں قحط پڑا اور جناب عائشہ سے شکایت کی گئی تو انھوں نے ترکیب بتائی کہ قبر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک حصہ زیر آسمان کر دو۔ چنانچہ بارش ہوئی اور حضرت عمر نے حضرت عباس عم رسولؐ کے ذریعے سے بارش طلب کی۔

یہ کہ "ہولناک جنگلوں میں انھیں مدد کے لیے پکارتے ہیں" اس کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت موجود ہے جسے طبرانی نے درج کیا ہے کہ حضرتؐ نے فرمایا جب تم میں سے کسی کی کوئی چیز کھو جائے یا ایسی جگہ ہو جہاں کوئی مددگار نہیں ہو تو کہے "اے بندگان خدا میری مدد کرو"۔ ایک روایت میں ہے کہ "میری فریاد کو پہنچو" اس لیے کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنھیں تم نہیں دیکھتے ہو۔

یہ کہنا کہ "یہ لوگ لڑکیوں کی شادی وغیرہ کے لیے ان سے التجا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے مطلبوں میں ان پر بھروسہ کرتے ہیں" تو بے شک یہ سب اس حد تک درست ہے کہ یہ ان سے ان مقاصد میں اپنے لیے دعا کے طلب گار ہوتے ہیں اور اس معنی سے ان سے مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر اس کے ...۔ یہ کہنا کہ "یہ ان سے گناہوں کی بخشش کے طالب ہوتے ہیں" ایک جسارت آمیز جھوٹ ہے۔ کوئی مومن گناہوں کی معافی کی التجا خود ان سے نہیں کرتا بلکہ ان کی شفاعت کا امیدوار ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں ان کے واسطے سے طالب مغفرت ہوتا ہے۔ بے شک وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان ائمہ طاہرین اور مقربین الٰہی کے دامن سے وابستگی ان کی طرف رحمت الٰہی کو متوجہ کرے گی جیسا کہ اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں حدیث رسولؐ ہے کہ

"میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی"

اور استغفار کے لیے جیسا کہ رسولؐ سے توسّل کی بحث میں بیان ہو چکا ہے خداوند عالم نے قرآن میں حکم دیا ہے کہ رسولؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوں اور وہاں آکر استغفار کریں اور پھر رسولؐ اُن کے لیے خدا سے استغفار کریں تو پھر مغفرت الٰہی کا انھیں امیدوار ہونا چاہیے اور خود رسولؐ کو حکم دیا کہ آپ مومنین و مومنات کے لیے استغفار کیجیے اور سورۂ یوسف میں یعقوبؑ کے فرزندوں کی زبانی ہے کہ انھوں نے اپنے والد بزرگوار سے کہا کہ ہمارے لیے بارگاہ الٰہی میں استغفار کیجیے اور انھوں نے وعدہ کیا کہ میں تمہارے لیے استغفار کروں گا اور حضرت ابراہیمؑ نے اپنے مُنھ بولے باپ سے وعدہ کیا کہ میں آپ کے لیے استغفار کروں گا اور پھر اُس وعدے کی بنا پر استغفار کیا بھی اور قرآن مجید میں سورۂ نوح میں جناب نوحؑ کی دعا ہے کہ جو مومن میرے گھر میں آئے اس کی مغفرت فرما۔

یہ کہنا کہ اُن مسلمانوں کے دل میں جو اولیاء الٰہی سے دُعا مانگتے ہیں، خدا کا تصور بالکل نہیں ہوتا مومنین کے ساتھ سوئے ظن بلکہ افترا اور بہتان ہے۔ اس شخص کو اُن کے دل کا حال کیونکر معلوم ہے؟ یقیناً ذرا بھی بصیرت رکھنے والا ہر صاحبِ ایمان جانتا ہے کہ اصل مرکز حاجات اللہ سبحانہٗ ہے اور یہ تمام اولیاء و صالحین اُسی کی عبادت اور اطاعت سے اس مرتبے تک پہونچے ہیں۔ اس کے خلاف اور اس کے سوا ان کے دل میں ہرگز کوئی دوسرا تصور نہیں ہوتا۔

بیشک عام صوفیا کے متعلق ہمیں ذاتی طور پر کوئی علم نہیں ہے، نہ ہم اُن کی طرف سے وکالت کرنے کے موقف میں ہیں۔ مگر خیال یہ ہے کہ وہ بھی اپنے پیروں، مرشدوں اور اولیاء کے متعلق یہ تصور نہیں رکھتے کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر ذاتاً نفع اور نقصان پہونچانے پر قادر ہیں۔ لیکن نجدی عالم نے جو اُن کا قول بیان کیا ہے کہ اللہ نے ہر ولی کے ساتھ ایک فرشتہ مقرر کیا ہے جو سوال کرنے والے کی حاجت کو پورا کرے تو اسے

ایک بے بنیاد بات تو سمجھا جا سکتا ہے لیکن کفر یا شرک کا موجب قرار نہیں دیا جا سکتا جبکہ یہ بالکل صحیح ہے کہ خداوند عالم نے کائنات میں مختلف کاموں کے لیے فرشتے مقرر کیے ہیں مثلاً جبرئیل امین وحی ہیں۔ اسرافیل کے ذمّے صور پھونکنا ہے، مالک خزانہ دار جہنّم ہیں، رضوان خازن جنّت ہیں، عزرائیل ملک الموت ہیں وغیرہ وغیرہ۔ تو اگر بالفرض اللہ کوئی فرشتہ لوگوں کی حاجت براری کے لیے کسی محل خاص پر مقرر کردے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ اور یہ اُن آیاتِ قرآنی کے بالکل خلاف نہیں ہے جن کا مضمون یہ ہے کہ اللہ حاجت براری کرتا ہے جیسے پہلے آچکا ہے کہ وفات دینا اللہ کا کام ہے لیکن خود قرآن میں ایک جگہ اس کی نسبت ملک الموت کی طرف دی گئی ہے اور کسی جگہ فرشتوں کی طرف۔

سب سے زیادہ ان وہابیوں کو شاق اہل بیت طاہرین علیہم السّلام کے عتباتِ عالیات کی جو عراق میں ہیں، مرجعیت و مرکزیت ہے جس میں اس عناد کا دخل ہے جو بعدِ رسولؐ ایک طبقے کو اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ و علیہم اجمعین سے ہو گیا۔ اس سلسلے میں یہ لوگ موالیانِ اہل بیت علیہم السّلام پر تہمت تراشی اور بہتان طرازی کی انتہا کر دیتے ہیں حالانکہ جو شخص صاف دل اور بے لوث نیت کے ساتھ ان روضوں پر آئے اُسے خالق کریم کی بارگاہ میں خضوع و خشوع اور اُس کی جناب میں اخلاص و عبادت کے وہ نمونے نظر آئیں گے جن کی نظیر کسی دوسرے مقام پر نہ ملے گی اور ان کے سلام اور زیارات کو سنے تو ان کی ہر لفظ سے توحید الٰہی اور اس کی عظمت کا اقرار نمایاں ہوتا ہے مثلاً امیر المومنین حضرت علی علیہ السّلام کے روضے پر پہلے ہی جو اذنِ دخول پڑھا جاتا ہے، اُس میں ہے:

"کوئی خدا نہیں سوا اللہ کے وہ ایک اکیلا ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں جو اُس کی طرف سے حق کو لے کر آئے۔

اور اُس کے پیغمبروں کی تصدیق کی" (تا آخر مضمون)

ایسے ہی الفاظ تمام زیارتوں اور دعاؤں میں ہیں جو ان مشاہد مقدسہ پر پڑھے جاتے ہیں اور زیارت کے بعد جو دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے، اُس کے بعد کہا جاتا ہے:

"خداوندا! میں یہ دو رکعت نماز پڑھی ہے ہدیہ کرنے کے لیے اپنے مولا، تیرے ولی خاص، تیرے رسول کے بھائی، امیرالمؤمنین علی بن ابی طالبؑ کے لیے خداوندا! تو درود بھیج محمدؐ و آل محمدؐ پر اور اس نماز و زیارت کو مجھ سے قبول فرما اور مجھے اس پر وہ جزا عطا کر جو حُسنِ عمل رکھنے والوں کو عطا ہوتی ہے۔ اے خدا! میں نے تیرے ہی لیے نماز پڑھی ہے اور تیرے ہی لیے رکوع کیا ہے اور تجھ ہی کو سجدہ کیا ہے۔ تو ایک اکیلا ہے، تیرا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس لیے کہ نماز اور رکوع و سجود بس تیرے ہی لیے ہو سکتا ہے کیونکہ سوا تیرے کوئی خدا نہیں۔ خداوندا! مجھے میرا مقصد عطا فرما بواسطہ محمدؐ و آلِ محمدؐ۔"

اور ایسا ہی تمام مشاہد مقدسہ پر ہوتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ان مشاہد مشرفہ پر حاضر ہونے سے توحید کی بنیادیں زیادہ مستحکم ہوتی ہیں، مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہوتی ہے اور کفر و الحاد کے تصورات کا استیصال ہوتا ہے۔ اس کے خلاف جو زہر افشانی اور بہتان طرازی ہوتی ہے، اُس کی صحیح پاداش خداوند عالم کے ہاتھ میں ہے جبکہ اس بے بنیاد تصور سے کتنے بے گناہوں کا خون بہایا جاتا رہا ہے اور اُن کی ہتک حرمت کی جاتی رہی ہے۔ جو وہابی کردار کے متعلق بتواتر ثابت ہے۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے "ابجد العلوم" میں لکھا ہے کہ شیخ محمد حازی شاگرد علامہ شوکانی نے ابن عبدالوہاب کے لیے لکھا ہے کہ ابن عبدالوہاب کی کتابوں میں بعض باتیں قابلِ قبول ہیں اور بعض رد کر دینے کے قابل ہیں اور سب سے زیادہ مشہور

ان کی دو خصوصیتیں ہیں:

ایک: تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو کافر سمجھنا۔

دوسرے: مسلمانوں کا بغیر ثبوت اور گواہ کے خون بہانا۔

دوسری جگہ ہے کہ وہاں کے جاہل عربوں کو اُنھوں نے سمجھایا کہ پیغمبر یا کسی عالم سے جو توسل کرے، وہ مشرک ہو جاتا ہے اور آگے بڑھ کر اُنھوں نے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا چنانچہ محمد بن اسماعیل صنعانی جو بہت بڑے عالم تھے، پہلے انھوں نے ابن عبدالوہاب کے متعلق کچھ ملے ہوئے اطلاعات کی بنا پر مدح میں قصیدہ کہا تھا جس کی ابتدا ر نجد اور اہل نجد پر سلام سے تھی بعد میں جب معتبر ذرائع سے وہاں کے مزید حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے دوسرے اشعار پہلے قصیدے پر پشیمانی اور توبہ کے مضمون کے کہے اور اس طرح اعلان کیا کہ میں اپنے ان اشعار کو جو میں نے مدح میں کہے تھے، واپس لیتا ہوں کہ اب مجھ پر صورت حال اُس کے خلاف ظاہر ہو گئی ہے اور خود اپنے ان دوسرے اشعار کی شرح لکھی جس کا نام رکھا "محو الحوبۃ فی شرح ابیات التوبہ" یعنی "گناہ کا مٹانا توبہ والے اشعار کی شرح میں" اس میں لکھا ہے کہ پہلے ایک نجدی عالم نے آ کر ابن عبدالوہاب کی بڑی تعریف و توصیف کی تھی جس کی بنا پر میں نے وہ قصیدہ کہا لیکن بعد میں مجھے ابن عبدالوہاب کی بہت سی قابلِ اعتراض باتیں معلوم ہوئیں جیسے خونریزی اور لوٹ مار اور دھوکا دے کر خاص خاص افراد کی جان لینا اور تمام روئے زمین کے مسلمانوں کو کافر قرار دینا اور اس سلسلے میں خود ابن عبدالوہاب کے بعض رسالے ہم تک پہونچے ہیں جن میں انھوں نے تمام مسلمانوں کے کافر ہونے کے بخیال خود دلائل تحریر کیے ہیں تو ہم نے ان کے حال کو ایسا پایا کہ جیسے کوئی شخص تھوڑا علم شریعت کا حاصل کرے مگر اس نے غور و فکر سے کام نہ لیا ہو اور نہ کسی ایسے استاد سے پڑھا ہو جو اُسے صحیح راستہ دکھائے، بلکہ اس نے بطور خود شیخ ابن تیمیہ

اور اُن کے شاگرد ابن قیم جوزیہ کے کچھ تصانیف کا مطالعہ کیا اور بے سمجھے ہوئے اُن کی تقلید کرلی ہو حالانکہ خود وہ دونوں تقلید کو حرام قرار دیتے ہیں۔

سیّد محمد امین بن عمر معروف بابن عابدین نے اپنی کتاب "ردّ المحتار" کی تیسری جلد میں "بغاۃ" کے ذکر کے ذیل میں لکھا ہے:

" جیسا کہ اس زمانے میں ابن عبدالوہاب کے تابعین میں ہوا جنھوں نے نجد سے خروج کیا اور حرمین مکّہ و مدینہ پر قبضہ کرلیا۔ یہ لوگ حنبلی ہونے کے دعویدار تھے لیکن انھوں نے یہ عقیدہ اختیار کیا کہ بس وہ مسلمان ہیں اور اُن کے مخالف جتنے ہیں سب مشرک ہیں اور اس طرح اہل سنّت اور اُن کے علماء کے قتل کو مُباح سمجھا۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کی طاقت کو توڑا اور اُن کے شہروں کو برباد کیا اور ۱۲۳۳ھ میں مسلمان اُن پر غالب آئے۔"

خود وہابی عالم سلیمان بن عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نے اپنی کتاب "توضیح" میں لکھا ہے کہ

" اہلِ توحید کے لیے ان مسلمانوں کے اموال اور عورتیں سب حلال ہیں اور وہ انھیں غلام اور کنیز بنا سکتے ہیں۔"

یہ درحقیقت ان کے پہلے خوارج نہروان کا مذہب رہا ہے جنھوں نے جناب امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام اور ان کے ساتھ کے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور اُن کے جان و مال کو مباح سمجھا اور غور کی نگاہ سے دیکھا جائے تو بہت باتوں میں یہ وہابی لوگ انہی خوارج کے ہم مسلک ہیں۔ جیسے وہ نعرہ لگاتے تھے کہ "حُکم بس اللہ کے لیے ہے" یہ جملہ حق تھا مگر مقصد ان کا باطل تھا۔ اسی طرح ان کا نعرہ ہے کہ تعظیم صرف اللہ کے لیے ہے، دعا بس اللہ سے مانگی جائے۔ محبت بس اللہ سے رکھی جائے۔ یہ سب جملے درست ہیں مگر مقصود ان سے غلط ہے۔

پھر جب تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ خوارج کی اہم شخصیتیں سب نجدی تھیں۔ چنانچہ اُن کا سپہ سالار جنگ میں شبث بن ربعی اور ایک بڑا سردار مسعر بن فدکی دونوں تمیمی تھے اور ابن عبدالوہاب کا قبیلہ بھی بنی تمیم ہے اور وہابی جماعت کے فرقۂ خوارج میں سے ہونے کا انکشاف شیخ محمد بن یوسف مشہور بہ لقب "کافی" نے اپنی کتاب "الحصون والجنۃ علیٰ عقیدۃ اھل السنۃ" میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" آج کل یہ ذہنیت چل پڑی ہے کہ اولیائے الٰہی کے کرامات کا انکار کیا جاتا ہے اور اُن کے قبور کی زیارت کو منع کیا جاتا ہے اور اُن کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں توسّل سے انکار کیا جاتا ہے۔ یہ اصل میں اطراف بغداد میں بعض خوارج کا مذہب تھا اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ جس نے کسی قبر کی زیارت کی، وہ ایسا ہے جیسے اُس نے کسی بُت کی پرستش کی اور یہ سب باطل ہے۔ اس لیے کہ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبرستان زیارت کے لیے تشریف لے جاتے تھے اور تمام اُمّت کا اس پر اجماع رہا ہے۔ ایسے لوگوں سے بحث کرنا بالکل بے کار ہے۔"

آلوسی مصنّف "تاریخ نجد" اگرچہ خود وہابیت کی طرف مائل ہیں جو اُن کے انداز تحریر سے ظاہر ہے لیکن کچھ نہ کچھ حق بات اُن کے قلم کی زبان پر بھی جاری ہوگئی ہے۔ انھوں نے سعود بن عبدالعزیز کے حال میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے لشکر ہر طرف بھیجے اور تمام بڑے بڑے رؤسائے عرب کا سر اُن کے سامنے جھک گیا مگر یہ کہ انھوں نے حج روک دیا اور خلیفۃ المسلمین کے مقابلے میں خروج کیا اور اپنے مخالف مسلمانوں کو کافر قرار دینے میں غلو سے کام لیا اور کچھ حکموں میں بڑا تشدد کیا اور انھوں نے اکثر باتوں کو (جیسے خدا کے ہاتھ، چہرہ اور آنکھیں وغیرہ) ظاہری مفہوم پر محمول کیا۔ ہاں دوسرے لوگ ان کی مخالفت میں بھی حد سے بڑھ

گئے اور انصاف کا تقاضا ہے کہ درمیانی راستہ اختیار کیا جائے ۔ نہ اتنا تشدد ہونا چاہیے جیسا علمائے نجد اور اُن کے عوام میں ہے کہ مسلمانوں سے جنگ کا نام وہ "جہاد" رکھتے ہیں اور حج کو روکتے ہیں اور یہ اُس تساہلی سے کام لینا چاہیے جو عام طور پر شام اور عراق کے باشندوں میں ہے کہ غیر خدا کی قسم کھاتے ہیں اور بڑی سونے اور چاندی سے آراستہ اور رنگ برنگ کی منقش عمارتیں صالحین و مقربین کے قبور پر بناتے ہیں اور اُن کے لیے نذر کرتے ہیں اور ایسی ہی باتیں جن سے شارع نے منع کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دین کے بارے میں افراط و تفریط کوئی رُخ مسلمانوں کی شان کے لائق نہیں ہے بلکہ مناسب یہی ہے کہ سلف صالحین کی پیروی کی جائے اور ایک دوسرے کو کافر کہنا غضب الٰہی کا باعث ہے ۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ تمام مسلمانانِ عالم کو کافر کہتے ہیں تو اب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث دیکھیے جو صحیح بخاری میں ہے کہ :

" جو کسی کو کافر کہے تو اُس کی زد میں اُن دونوں میں سے ایک ضرور آئے گا یعنی اگر وہ مسلمان جسے کافر کہا ہے، واقعاً کافر نہیں ہے تو لازماً کافر کہنے والا پیش خدا کافر قرار پائے گا "

اس کے علاوہ یہ پہلے آچکا ہے کہ یہ لوگ مجسمہ میں داخل ہیں اور مجسمہ کو تمام علمائے اسلام کافر کہتے ہیں ۔ پھر اہل بیت رسول علیہم السّلام سے دشمنی جسے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفر کا مصداق قرار دیا ہے۔ پھر خوارج کے کفر پر علمائے اسلام متفق ہیں یہاں تک کہ ابن عبدالوہاب کی کتاب "التوحید" کے شارح نے بھی لکھا ہے کہ

" رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوارج کے لیے گواہی دی ہے کہ وہ کثرت سے نماز، روزہ اور تلاوتِ قرآن کے کام انجام دیتے ہوں گے، اور

لا الٰہ الا اللہ کا کلمہ پڑھتے ہوں گے اور اس کے باوجود وہ محکوم بکفر ہیں اور حضرتؐ نے فرمایا کہ اگر میں اس زمانے میں ہوں تو انھیں قتل کردوں جیسا کہ صحیحین میں ہے "

پھر جیسے خوارج اُن آیات کو جو کفار و مشرکین کے بارے میں ہیں مسلمین و مومنین پر منطبق کرتے تھے، اسی طرح یہ وہابی حضرات تمام آیتوں کو جو مشرکین کے بارے میں ہیں مسلمانانِ عالم پر منطبق کرتے ہیں ۔ جیسا کہ ابن عبدالوہاب کی اُس عبارت سے جسے آلوسی نے نقل کیا ہے، معلوم ہو گیا اور ابن عبدالوہاب نے اس بارے میں مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "کشف الشبہات فی التمسکات بالمتشابہات" جس میں بڑی تفصیل کے ساتھ اُن شرک والی آیتوں کو مسلمانوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی اطلاع بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دے دی تھی جیسا کہ بخاری نے اپنی صحیح میں عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے خوارج کے وصف میں کہ انھوں نے اُن آیتوں کو جو کافروں کے بارے میں ہیں، مومنین کے بارے میں قرار دے دیا اور ایک روایت میں ابن عمر کی جسے بخاری کے علاوہ دوسروں نے نقل کیا ہے ۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ :

" سب سے زیادہ مجھے اپنی اُمت کے لیے جو پریشانی ہے وہ اُس شخص سے جو قرآن کی آیتوں کو بے محل صرف کرے "

اس کا ابن دحلان نے ذکر کیا ہے اور جس طرح خوارج نے مسلمانوں کا خون مُباح سمجھ لیا تھا اور ناحق مومنین کی خونریزی جائز سمجھی تھی، اسی طرح ان وہابیوں نے ان بے شمار مسلمانوں کو تہ تیغ کیا ۔ چنانچہ "کشف الارتیاب" میں ہے کہ اُن کے ہاتھوں جو مسلمان قتل ہوئے اُن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے ۔ اور طائف میں امان دینے کے معاہدے کے بعد انھوں نے قتل عام کیا حالانکہ ارشادِ

الٰہی ہے کہ :

"جو کسی ایک مومن کو قتل کرے، وہ ایسا ہے کہ اُس نے تمام انسانوں کو قتل کیا۔"

چہ جائیکہ وہ لوگ جنھوں نے ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر دیا ہو اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ :

"مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اُسے قتل کرنا کفر ہے۔"

اسے ابن ماجہ نے اپنے سنن میں درج کیا ہے۔ نیز ارشادِ الٰہی ہے کہ :

"جو ایک مومن کو قتل کرے، اُس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اللہ اس پر غضب ناک ہوگا اور اُس پر لعنت کرے گا اور اُسے بڑا عذاب کرے گا۔"

پانچواں باب

وہابی عقیدہ انبیاء وصالحین کے قبور کے بارے میں

اُن کا مذہب یہ ہے کہ قبور پر کوئی عمارت بنانا حرام ہے اور نہ اُن کے گرد کوئی عمارت بنانا چاہیے اور وہاں دعا مانگنا اور نماز پڑھنا، یہ سب باتیں حرام ہیں، بلکہ ان سب کا انہدام اور ان کا مٹا دینا واجب ہے۔ یہاں تک کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک، اس کا بھی یہی حکم ہے۔ ابن عبدالوہاب اور اُن کے تابعین کے نزدیک یہ مشاہد اور قبور سب مثل بتوں کے ہیں اور قبر رسولؐ کو وہ (معاذ اللہ) سب سے بڑا بُت سمجھتے ہیں۔

ان تمام اقوال میں بھی ان کے پیشوا، وہی ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد ابن قیم ہیں۔ چنانچہ ابن قیم نے اپنی کتاب "زاد المعاد فی ھدی خیر العباد" میں تصریح کی ہے کہ ان روضوں کا جو قبور پر بنے ہوئے ہیں، جہاں تک قدرت ہو، گرانا واجب ہے اور ان کا ایک دن بھی باقی رکھنا حرام ہے، اس لیے کہ یہ لات اور عزّیٰ (اصنام) کے مثل ہیں بلکہ اُن سے بڑھ کر یہاں شرک ہوتا ہے اور حاکم وقت پر لازم ہے کہ اُن اموال کو جو روضوں کے لیے لائے جاتے ہیں، لے کر دوسرے مصارف میں صرف کر دے

جیسا کہ رسولؐ نے لات (بت) کے اموال کے ساتھ کیا تھا۔ اسی طرح ان عمارتوں کو گرانا واجب ہے یا یہ کہ فروخت کرکے اُن کی قیمت مسلمانوں کے مفاد کے کاموں میں صرف کرے۔ اسی طرح ان اوقاف کو جو ان سے متعلق ہیں۔ اس لیے کہ وقف ان پر باطل ہے اور یہ مال ہے جو ضائع ہو رہا ہے لہٰذا اُسے صرف کر دینا چاہیے، مسلمانوں کے کاموں میں۔ اور جلد دوم میں لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے مسجدِ ضرار کو منہدم کر دیا تو یہ مزارات کی جو عمارتیں ہیں کیونکہ قابلِ انہدام نہ ہوں گی اور نیک کام کے خلاف کوئی وقف صحیح نہیں ہے۔ اور وہ مسجد بھی جو کسی قبر پر ہو منہدم کر دینا چاہیے جس طرح اُس میت کو جو مسجد میں دفن ہو قبر کھود کر نکال دینا چاہیے کیوں کہ دینِ اسلام میں مسجد اور قبر دونوں اکٹھا نہیں ہو سکتے بلکہ جو پہلے ہو، وہ صحیح ہے اور جو بعد میں ہے، اُسے منع کیا جائے گا۔

اب اس محل پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نجد کے قاضی القضاۃ ابن بلیہد کے استفتاء اور اُس جواب کو جو علمائے مدینہ کی طرف منسوب کرکے انہدام جنۃ البقیع کے موقع پر شائع ہوا تھا، یہاں درج کیا جائے جس سے اُن کا عقیدہ اس سلسلے میں بالکل ظاہر ہو جائے گا۔ بعد میں ہم اُن دونوں کے مندرجات کی کافی و وافی رد کریں گے۔ انتہیٰ

اِستفتاء

کیا قول ہے علمائے مدینہ منورہ کا (خدا اُن کی سمجھ اور علم میں زیادتی کرے) قبروں پر عمارت اور انھیں مسجد بنا لینے کے بارے میں، یہ جائز ہے یا نہیں؟ اور جبکہ وہ ناجائز ہے بلکہ اُس کی سختی سے ممانعت ہے تو کیا اُن کا گرانا اور ان کے پاس نماز پڑھنے کو روکنا واجب ہے؟ اور جب وہ عمارت ایک وقفی زمین پر ہو جیسے بقیع اور وہ مانع ہو اُس مقدار میں فائدہ اٹھانے سے جس پر عمارت ہے تو کیا یہ غصب ہے جس کا ختم کرنا ضروری ہے تاکہ دوسرے مستحقین پر ظلم نہ ہو اور ان کے حقوق مارے نہ جائیں

یا یہ واجب نہیں ہے؟ اور جو کچھ جاہل لوگ ان ضریحوں کے پاس کرتے ہیں کہ اُن سے مسح کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ ساتھ اُن سے دعا مانگتے ہیں اور بقصدِ قربت کرتے ہیں اُس صاحبِ قبر سے اور اُس کی نذر مانتے ہیں اور وہاں روشنی کرتے ہیں یہ سب جائز ہے یا نہیں؟ اور جو یہ لوگ حجرۂ رسولؐ کے پاس کرتے ہیں کہ دعا وغیرہ کے وقت اُدھر رُخ کرتے ہیں اور طواف کرتے ہیں اور بوسہ لیتے ہیں اور مسح کرتے ہیں، اسی طرح جو مسجد شریف میں کرتے ہیں کہ ترحیم اور تذکیر کرتے ہیں اذان اور اقامت کے بیچ میں اور نمازِ جمعہ کے پہلے۔ کیا یہ شرع میں وارد ہے یا نہیں؟

اس سوال کی غلطی بلکہ غلط بیانی

اس سوال میں ایک بڑی غلط بیانی موجود ہے کہ بقیع کی زمین وقفی ہے۔ اور یہ عمارتیں حقداروں کو اُن کے حقوق سے روکتی ہیں، اس لیے اُن کا ہٹانا واجب ہے۔ اور اس کی تائید اس مفروضے پر شافعی کے قول سے ہوگی کتاب الام میں کہ قبر کی عمارت اگر وقفی زمین پر بنائی گئی ہو تو اس کا گرانا واجب ہے۔ یہ غلط اس لیے ہے کہ کتب تاریخ و سیر کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بقیع کی عمارتیں کسی وقفی زمین پر نہیں ہیں بلکہ تمام مملوکہ زمینوں پر بنی ہیں چنانچہ صاحب وفاء الوفاء نے ابراہیم فرزند پیغمبرؐ کی قبر کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک گھر تھا جو بعد میں محمد بن زید بن علی کی ملکیت میں آیا۔ پھر اسی قبر کے پہلو میں عثمان بن مظعون اور پھر یہیں عبدالرحمٰن بن عوف کی قبریں بنیں۔ یہ سب ایک قبے میں تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قبہ مملوکہ زمین میں تھا۔ پھر ازواجِ رسولؐ کا قبہ، وہ ملکیت تھا عقیل ابن ابی طالب کی۔ اس کا بھی ذکر وفاء الوفاء میں ہے۔ اب رہا ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا قبہ تو کتبِ سیر سے ظاہر ہے کہ یہ جناب عباس بن عبدالمطلب کا قبہ تھا۔ چنانچہ صواعق محرقہ علامہ ابن حجر مکی میں امام محمد باقر علیہ السلام کے حال میں

ہے کہ وہ اپنے پدر بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ امام حسنؑ اور عباس کے قبہ میں جو بقیع میں ہے۔ اور عباس کے قبہ کے لیے باخبر مصنفین نے لکھا ہے کہ عقیل کے مکان کے گوشے میں تھی۔ چنانچہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب "جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب" میں لکھتے ہیں کہ:

"عباس بن عبدالمطلب کو بھی فاطمہ بنت اسد بن ہاشم کے قبہ کے نزدیک مقابر بنی ہاشم کے شروع میں جو عقیل کے مکان کے گوشے میں ہے دفن کیا۔"

اس سے ثابت ہوا کہ یہ قبہ بھی مملوکہ زمین میں تھا۔ اور علامہ سید ابراہیم راوی رفاعی نے اپنی کتاب "اوراق بغداديه" میں لکھا ہے کہ امام شافعی کا قبہ ابن عبدالحکم کے گھر میں تھا۔ رہ گئی بقیع کی سرزمین، اس کا وقف ہونا ثابت نہیں ہے۔

علاوہ اُن تصریحات کے جو پہلے اس زمین کے مملوک ہونے کے متعلق آچکے ہیں گزشتہ صدیوں میں برابر علمائے اسلام کا اس پر اعتراض نہ کرنا بھی بتاتا ہے کہ اُن کے نزدیک ان قبوں میں کوئی شرعی محذور نہ تھا اور مسلمانوں کا ہر دور میں ان کی تعمیر و درستی کی طرف متوجہ رہنا ان کے نزدیک اُن کے استحسان کی دلیل ہے اور اگر وہابیین انتہائی دھاندلی سے کام لے کر اُن تاریخی تصریحات کو قبول نہ کریں جو ان کی زمین کے مختلف اشخاص کی ملکیت ہونے کو بتاتے ہیں، حالانکہ یہ انصاف سے بہت دُور ہے، اس لیے کہ تاریخی واقعات میں اہل تاریخ کے بیان پر اعتماد کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔ پھر بھی جب حدیث اور تاریخ میں اس کا پتہ نہیں ہے کہ یہ زمین پہلے کس کی ملکیت تھی اور اُس نے اُسے وقف کیا تو سمجھنا ہوگا کہ وہ ابتدائی حالت پر باقی ہے کہ تمام زمین ملک خدا ہے اور تمام خلق کے لیے مباح ہے اور اُس کا حکم یہ ہے کہ جو کوئی قطعۂ زمین کو محدود بنا کر اُس پر کوئی عمارت بنالے، وہ اُس سے مخصوص ہو جائے گی۔ پھر کسی دوسرے کو اس کا منہدم کرنا جائز نہ ہوگا۔

یہ تھی وہ غلطی اور غلط بیانی جو اصل سوال میں تھی اور وہ سوال علماء سے چونکہ کسی عامی جاہل کا نہ تھا بلکہ ایک بڑی وہابی شخصیت یعنی اُن کے قاضی القضاۃ کا تھا لہٰذا اس پر نظر ڈالنا ضروری تھا۔ اب اُس کا جواب جو علمائے مدینہ کی طرف منسوب کر کے نجدی حکومت نے شائع کیا تھا، وہ ملاحظہ ہو:

جواب

قبروں پر عمارت بنانا اجماعاً ممنوع ہے۔ اس لیے کہ اس کی ممانعت میں جو احادیث ہیں، وہ صحیح السند ہیں لہٰذا بہت سے علماء نے فتوے دیا ہے کہ ان کا گرانا واجب ہے۔ اور اس میں وہ سند پیش کرتے ہیں حضرت علی کی حدیث کی کہ آپ نے ابوالہیاج سے فرمایا کہ میں تمھیں اس مہم کے لیے بھیجتا ہوں جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا کہ جو مورت تمھیں ملے اُسے مٹادو اور جو قبر اونچی ملے اُسے برابر کردو۔ اس کی مسلم نے روایت کی ہے اور قبروں پر مسجدیں بنانا اور وہاں نماز پڑھنا مطلقاً ممنوع ہے۔ اور وہاں چراغ جلانا بھی ممنوع ہے۔ ابن عباس کی حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت کی ان عورتوں پر جو قبروں کی زیارت کے لیے جائیں اور ان لوگوں پر جو وہاں مسجدیں بنائیں اور چراغ روشن کریں۔ اس کی اہل سنن نے روایت کی ہے۔ جاہل لوگ جو ضریحوں کے ساتھ تمسح کرتے ہیں اور بقصد قربت جانور ذبح کرتے ہیں اور نذریں دیتے ہیں اور اللہ کے ساتھ ان صاحبانِ قبور سے دعائیں مانگتے ہیں، یہ سب حرام ہے اور شرعاً ممنوع ہے جس کا کرنا بالکل جائز نہیں ہے اور دعا کے وقت حجرۂ پیغمبر کی طرف منہ کرنا، اسے بھی بہتر ہے کہ روکا جائے جیسا کہ مشہور و معروف مذہبی معتبر کتابوں میں درج ہے اور تمام سمتوں سے بہتر سمت کعبہ ہے اور طواف اور تمسح اور ترحیم اور تسلیم مذکورہ اوقات میں، یہ سب بعد کی ایجاد کی ہوئی چیزیں ہیں جو بری

ناقص سمجھ میں آیا ہے، وہ یہ ہے اور ہر صاحبِ علم سے بالا تر ایک بڑا عالم ہے۔

۲۵ رمضان ۱۳۴۴ھ

جوابِ مذکور کی رد

علمائے مدینہ کے اس فتوے کی رد علامہ سید حسن صدر اور علامہ شیخ جواد بلاغی وغیرہ ایسے بزرگ علما نے کی ہے مگر یہاں اُس کے ایک جز کی مکمل رد لکھی جاتی ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ قبور پر تعمیر کا جواز کتابِ الٰہی اور سنتِ مصطفوی اور مسلمانوں کے عمل درآمد سب سے ثابت ہے۔

کتابِ الٰہی میں اس موقع کے ذکر میں جب لوگوں کو اطلاع ہوئی اور وہ لوگ اُس غار کے پاس آئے جہاں اصحابِ کہف محوِ آرام تھے، یہ آیت ہے کہ

"اُن سب نے کہا کہ اُن پر ایک عمارت قائم کرو۔ اُنھوں نے جو ان کے سلسلے میں غالب آئے، کہا کہ ہم اُن پر مسجد تعمیر کریں گے۔"

اندازِ بیان سے ظاہر ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کے اس فیصلے کو جو اُنھوں نے کیا بصورتِ استحسان درج کیا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں انبیائے ماسلف اور اُممِ سابقہ کے حالات صرف تفریحِ طبائع کے لیے درج نہیں ہوتے بلکہ اس لیے کہ اُن سے اس اُمت کو درس حاصل ہو تو اگر عمارت بنانا قبر پر اللہ کے نزدیک اس اُمت کے لیے قابلِ مذمت امر ہوتا تو وہ اس واقعہ کے درج کرنے میں اُس پر متنبہ فرماتا تاکہ اس اُمت کے افراد اُس سے پرہیز کریں۔ جب ایسا نہیں ہوا اور اُس نے اس واقعہ کو اس انداز میں بیان فرمایا تو اس سے اس کی تائید ثابت ہوئی اور یہ ظاہر ہوا کہ یہ فیصلہ اُس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوا اور وہ اس لائق ہے کہ اس اُمت کے افراد اس کی پیروی

کریں اور حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کے علاوہ اگر اس مدعا کے لیے کوئی دلیل نہ ہوتی تو بس یہ آیت اُس کے ثبوت کے لیے کافی تھی۔ مگر چونکہ یہ وہابیوں کے عقیدے کے بالکل خلاف ہے اس لیے ابن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کے شارح نے اسے درج کرنے کے بعد لکھ دیا ہے کہ

"یہ اس کی دلیل ہے کہ جو اُن کے معاملے میں غالب آئے وہ کافر تھے۔ اس لیے کہ اگر وہ مومن ہوتے تو یہ فیصلہ نہ کرتے کہ نیک اعمال اشخاص کی قبروں پر مسجد بنائیں جبکہ ہمارے پیغمبرؐ نے ایسا کرنے والے پر لعنت کی ہے۔"

یعنی انھوں نے اپنے مسلک کو اصل قرار دے کر قرآن کو اپنا تابع بنانا چاہا ہے اور اس لیے ہزاروں مسلمانوں پر کفر کے فتووں کا سیلاب اُن کا اتنا بڑھا کہ گذشتہ دور کے سچے مسلمانوں پر بھی وہ فتوائے کفر لگانے لگے مگر اول تو پوری آیت پڑھیے تو پتہ لگے گا کہ عمارت بنانے پر دونوں فریق متفق تھے۔ اختلاف بس یہ تھا کہ عمارت کس طرح کی ہو؟ تو اگر وہ بالفرض غالب آنے والے کافر ہوں، تو بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پھر یہ کہ مفسرین تصریح کرتے ہیں کہ غالب آنے والے لوگ مومنین تھے۔ چنانچہ معالم التنزیل بغوی میں ہے کہ:

"مسلمانوں نے کہا ہم ان پر مسجد کی تعمیر کریں گے جس میں پروردگارِ عالمیان کے لیے لوگ نمازیں پڑھیں۔"

خازن نے لباب التاویل میں لکھا ہے کہ

"ابن عباس نے اس عمارت کے بارے میں فرمایا کہ مسلمانوں نے کہا ہم ان پر مسجد بنائیں گے جس میں لوگ نمازیں پڑھیں، اس لیے کہ یہ ہمارے دین پر تھے۔"

اسی طرح کے الفاظ تفسیر جلالین اور کشاف اور تفسیر ابوالسعود میں ہیں۔ اور "تنویر المقباس ابن عباس" میں ہے کہ:

"جو غالب آئے، وہ مومنین تھے، انھوں نے کہا کہ ہم ان پر مسجد بنائیں گے کہ

یہ ہمارے دین پر تھے"۔

اور نیشاپوری نے غرائب القرآن میں لکھا ہے کہ

"جو غالب آئے وہ مسلمان جماعت تھی اور اُن کا بادشاہ مسلمان تھا اس لیے انھوں نے وہاں مسجد بنائی جس میں مسلمان نماز پڑھیں اور اُن کے اس محل قیام سے برکت حاصل کریں اور ان ہی کو زیادہ حق تھا اُن قبور کی حفاظت کے لیے عمارت بنانے کا"۔

اس سب کے بعد کیا اس شخص کا یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ وہ غالب آنے والے معاذ اللہ کافر تھے جبکہ اتنے بڑے مفسرین جن میں ترجمان القرآن "حبر الامۃ" عبداللہ بن عباس بھی ہیں، انھیں اہل اسلام و ایمان سے بتا رہے ہیں۔

اس کے بعد آئیے سنت پر نظر ڈالیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ہماری گفتگو یہاں اس جماعت کے مقابلے میں ہے جن کے یہاں معیار سنت میں ایک تو وہ چیز ہے جو ہمارے اور اُن کے درمیان مشترک ہے یعنی سنت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جس میں آپ کا قول، فعل اور تقریر داخل ہے اور ایک بات میں وہ ہم سے الگ ہیں یعنے وہ صحابہ رسول کی پیروی کو بھی ضروری سمجھتے ہیں اور اس حدیث کو مانتے ہیں کہ میرے اصحاب مثل ستاروں کے ہیں جس کی پیروی کرو گے، ہدایت پاؤ گے تو اب ہمیں لازم ہے کہ قبروں کی تعمیر کے سلسلے میں پہلے سنت رسول کو پیش کریں۔ پھر سیرت صحابہ و تابعین کہ یہ سب حجت قائم ہونے کے لیے کافی ہے۔

(۱)

عثمان بن مظعون کی قبر کے لیے رسولؐ کا عمل

نور الدین سمہودی نے وفاء الوفاء میں لکھا ہے کہ:

"محمد بن قدامہ کی روایت ہے کہ ان کے باپ کے ذریعے اُن کے دادا سے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے عثمان بن مظعون کو دفن کیا تو حکم دیا کہ اُن کی قبر کے سرہانے ایک پتھر رکھ دیا جائے۔ قدامہ کا بیان ہے کہ جب عرصے کے بعد ہم بقیع میں گئے تو اُس پتھر کو دیکھا اور سمجھے کہ یہ عثمان بن مظعون کی قبر ہے"۔

دوسری روایت میں ہے کہ:

"حضرتؐ نے فرمایا کہ یہ پتھر میں اس لیے رکھواتا ہوں کہ میرے بھائی کی قبر کا اُس سے علم ہو اور اُس کے پاس اپنے عزیزوں میں جس کا انتقال ہو اُسے میں دفن کروں"۔

اور ظاہر ہے کہ کسی حکم یا عمل کے ساتھ جب وجہ بتا دی جائے تو وہ وجہ جس صورت سے زیادہ حاصل ہو، وہ حکم وہاں بدرجۂ اولیٰ جاری ہوگا۔ حضرتؐ نے پتھر رکھنے کی وجہ یہ بتائی کہ اس سے قبر کا علم ہو اور اُس سے اُس کے پاس دوسرے قبور بنائے جا سکیں اور ظاہر ہے کہ ضریح یا قبہ بنانے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے جو اُس سے بدرجۂ اتم پورا ہوتا ہے تو عمل حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا اُس کے استحسان کا ثبوت ہوگا۔

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ حضرتؐ کے سامنے بہت سے صحابہ کی وفات ہوئی، مگر کسی کے لیے حضرتؐ نے یہ اہتمام نہیں فرمایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سب دفن ہونے والے یکساں نہیں ہوتے اور اُسی لحاظ سے سب کی قبریں یکساں نہیں ہونا چاہئیں بلکہ بعض کو امتیاز خاص ہوتا ہے۔ خواہ سبقت ایمانی کی وجہ سے یا دینی اعزاز کی وجہ سے اور وہ ابتدائی اسلام کا دور بے سر و سامانی کا تھا۔ لہٰذا جو عام معیار زندگی پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور پھر دوسرے مسلمانوں کا تھا، اُس کے لحاظ سے ضریح اور قبے وغیرہ کی تعمیر ممکن نہ تھی، لہٰذا اُس وقت کے لحاظ سے امتیازی علامت جو ہو سکتی تھی، اُس کا عثمان بن مظعون کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انتظام کر دیا اور جب عام معیار زندگی مسلمانوں کا

اونچا ہو گیا تو اسی لحاظ سے انبیاء و اولیاء کے قبور کے لیے امتیازی نشان کے طور پر عمارتوں میں ترقی ہونے لگی۔ جو ہونا چاہیے تھی اور جتنا مرتبہ جس کا زیادہ ہو، اس کے لحاظ سے اس میں اضافہ ہونا چاہیے۔

(۲)

ابراہیم فرزندِ پیغمبرؐ کی قبر پر عمارت

اُسی کتاب وَفاء الوَفاء میں ابن زبالہ کی روایت ہے:

"سعید بن محمد بن جبیر سے کہ انھوں نے ابراہیم فرزند پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر دیکھی "زدراء" کے پاس۔ عبدالعزیز بن محمد نے کہا یہ وہ گھر ہے جو بعد میں زید ابن علیؑ کی ملکیت میں آیا۔"

اگر عمارت کا ہونا قبر پر جائز نہ ہوتا تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے فرزند ابراہیم کو گھر کے اندر کیوں دفن کرتے اور اگر ہم بالفرض یہ مانیں کہ قبر صحن میں تھی، جب بھی دیواریں صحن کی تو قبر کے گرد ہوں گی، حالانکہ وہابی لوگ اسے بھی ممنوع سمجھتے ہیں۔

(۳)

حضرت خاتون جنّت کی سیرت

وَفاء الوَفاء میں امام محمد باقر علیہ السلام کی روایت ہے کہ:

"جگر گوشۂ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا جناب حمزہ رضوان اللہ علیہ کی قبر کی زیارت کو جاتی تھیں اور اس کی مرمت کرتی تھیں اور درست کرتی تھیں اور انھوں نے بھی اُس کی شناخت کے لیے ایک پتھر رکھ دیا تھا۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عمل حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام کا اپنے والد بزرگوار کے دورِ حیات میں تھا اور ظاہر ہے کہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں تھا، اس لیے وہ تقریر رسولؐ میں داخل ہو کر جزو سنّت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرار پاتا ہے۔ اور یہ بالکل وہابی نظریے کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ وہ خاص طور پر خواتین کے لیے قبر کی زیارت کو قطعاً ممنوع سمجھتے ہیں اور پھر قبور کے امتیاز کو مطلق منع کرتے ہیں مگر جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا قبر حمزہ کی برابر مرمت کرتی رہتی تھیں۔ اگر اس کی بقا ضروری نہ سمجھتیں تو وقتاً فوقتاً اس کی خبر کیوں لیتیں اور جب حفاظت قبر کا مستحسن ہونا اس عمل سے ظاہر ہو گیا تو قبّے کی تعمیر کرنا جو اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے کیوں مستحسن نہ ہوگا؟

(۴)

قبرِ رسولؐ کے لیے حضرت علیؑ اور تمام اہل بیتؑ و صحابہؓ کا عمل

ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اگر قبر پر عمارت بنانا ممنوع ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، پہلے سے ہو اور اُس میں قبر بنائی جائے یا قبر پہلے ہو اور اُس پر عمارت تعمیر کی جائے۔ کیونکہ معیار دونوں میں ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگ زیارت کے لیے آئیں گے اور وہ عمارت اُن کے لیے باعثِ آرام ہوگی۔ اب اگر یہ چیز ممنوع ہو تو خود حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حجرۂ عائشہ میں کیوں دفن کیا جائے جس پر یقینی طور پر چھت تھی۔ خصوصیت کے ساتھ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام اس پر اقدام کیوں کرتے جبکہ وہابیوں کے قول کے مطابق اُنہی کو حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کی عمارتوں کو مسمار کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس سے

ظاہر ہے کہ اہل بیت اور صحابہ سب متفق تھے کہ قبر پر عمارت ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

(۵)

وقتاً فوقتاً روضۂ رسولؐ کے تجدید و استحکام کی کوشش

وفاء الوفاء سمہودی میں ہے کہ:

"پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حجرے کی چھت پہلے درختِ خرما کی چھال سے بنی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے جس نے اینٹوں والی چھت بنوائی" وہ خلیفۂ دوم عمر بن خطاب تھے۔"

اس کے بعد جیسا نووی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے:

"جب مسلمانوں کی کثرت ہوئی اور صحابہ و تابعین کو مسجد رسولؐ کی توسیع کی ضرورت ہوئی اور یہ توسیع ازواج رسولؐ کے مکانات تک پہونچ گئی جس میں حجرۂ عائشہ بھی تھا تو ان حضرات نے قبر رسولؐ کے گرد دائرے کی شکل میں اونچی دیواریں بنوادیں تاکہ قبر مسجد میں اس طرح نمایاں نہ ہو کہ عوام اس کی طرف رُخ کرکے نمازیں پڑھنے لگیں۔ پھر دو دیواریں قبر کے دو شمالی گوشوں سے ملا کر بنائیں تاکہ کوئی قبر کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھ ہی نہ سکے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ قبر پر یا قبر کے گرد عمارت میں کوئی حرج نہیں۔ بس قبر کی طرف رُخ کرکے نماز نہ ہونا چاہیے۔

اس کے بعد برابر روضۂ رسولؐ کی بقا اور تجدید میں اہتمام ہوتا رہا یہاں تک

کہ بخاری نے صحیح میں روایت کی ہے ہشام بن عروہ سے اور اُنھوں نے اپنے باپ عروہ بن زبیر سے کہ:

"جب ولید بن عبد الملک کے زمانے میں حجرۂ رسولؐ کی چار دیواری گر گئی اور اُس کی تعمیر شروع ہوئی تو ایک پیر باہر نکل آیا جس سے یہ خیال کرکے لوگ گھبرا گئے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا قدم مُبارک نہ ہو اور کوئی ایسا نہ ملا جو اس کے متعلق کسی اپنے علم کا اظہار کرے۔ بس عروہ بن زبیر نے دیکھ کر کہا کہ یہ بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا پائے مبارک نہیں ہے۔ ہو نہ ہو یہ عمر کا پیر ہے۔"

اور معلوم ہونا چاہیے کہ ولید کی خلافت ۸۶ھ سے ۹۶ھ تک تھی۔ اس زمانے تک صحابہ میں سے بعض افراد موجود تھے۔

(۶)

زوجۂ رسولؐ ام حبیبہ کی قبر پر عمارت

سمہودی نے لکھا ہے کہ زید بن سائب کی روایت ہے اپنے دادا کی زبانی کہ:

"جب عقیل بن ابی طالبؑ نے اپنے گھر میں ایک کنواں کھدوایا تو ایک منقش پتھر نکلا جس پر لکھا تھا کہ "یہ ام حبیبہ دختر صخر بن حرب کی قبر ہے" تو عقیل نے کنویں کو پٹوا دیا اور اُس پر عمارت بنوا دی۔ ابن سائب کا بیان ہے کہ میں پھر عمارت میں داخل ہوا تو میں نے وہ قبر خود دیکھی۔"

عماراتِ قبورِ انبیاء بالخصوص حضرت ابراہیمؑ

علّامۂ معاصر سیّد ابراہیم راوی رفاعی نے "اوراقِ بغدادیہ" میں لکھا ہے کہ:

"جب مسلمانوں نے شام اور بیت المقدس کو فتح کیا تو انبیاء کی قبروں پر عمارتیں دیکھیں۔ انھوں نے انھیں منہدم نہیں کیا اور سب سے زیادہ مشہور وہ عمارت ہے جو جناب ابراہیم خلیل اللہ کی قبر پر ہے اور اُسے خلیفۂ دوم عمر بن خطاب نے دیکھا اور اُسے منہدم نہیں کیا۔ اور شیخ تقی الدین ابن تیمیہ نے اپنی کتاب "صراط مستقیم" میں اس عمارت کے وجود کا جناب ابراہیمؑ کی قبر پر فتوحات کے دور میں ذکر کیا ہے مگر کہا ہے کہ سن ۴۰۰ھ تک اس عمارت کا دروازہ بند تھا۔"

ہم کہتے ہیں کہ صحابہ کا جن میں خلیفۂ دوم عمر بھی تھے، اس عمارت کو باقی رکھنا اس کی دلیل ہے کہ قبر پر عمارت کے ہونے میں اُن کے نزدیک کوئی حرج نہیں تھا، اور ابن تیمیہ کا یہ قول کہ دروازہ اس کا سن ۴۰۰ھ تک بند تھا، ایک ادّعا ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ تاریخ کا بیان اس کے خلاف ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ چوتھی صدی کے پہلے بھی لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت کو جاتے تھے۔ چنانچہ سیّدہ نفیسہ جن کی وفات دوسری صدی ہجری میں ہے، ہر نماز کے بعد دعا کرتی تھیں کہ

"خداوندا! مجھے اپنے خلیل ابراہیمؑ کی قبر کی زیارت نصیب کر۔"

اس کا ذکر عثمان بن مدوخ شافعی نے اپنی کتاب "العدل الشاهد فی تحقیق المشاهد" میں کیا ہے۔

جناب فاطمہ بنتِ اسد کی قبر پر عمارت

گزشتہ شواہد کے بعد ہی عمارتِ قبور کے جواز میں کوئی شک نہ رہنا چاہیے جبکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل اور تقریر اور پھر اہل بیت اور صحابہ و تابعین کا عمل خیر القرون اور اُس سے ملی ہوئی صدیوں میں برابر جاری رہا اور جو شخص مزید جستجو کرے، اُسے اور زیادہ پتہ چلے گا کہ پہلی ہی صدی میں قبّے کی تعمیر ہونے لگی تھی، چنانچہ سمہودی نے وفاء الوفاء میں لکھا ہے کہ:

"فاطمہ بنت اسد (مادر حضرت علی بن ابی طالب) کی قبر کے متعلق عبدالعزیز کی روایت ہے، جس کی سند محمد (حنفیہ) ابن علی بن ابی طالبؑ تک پہونچتی ہے، کہ جب فاطمہ بنت اسد کی حالت مرض میں خراب ہوئی اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو فرمایا کہ انتقال ہو جائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا چنانچہ جب ان کی وفات ہو گئی حضرتؐ کو اطلاع دی گئی۔ فوراً حضرت تشریف لائے اور اُن کی قبر کھودنے کا حکم دیا اُس مسجد کے اندر کی زمین پر جسے اب "قبر فاطمہ" کہا جاتا ہے۔"

سمہودی کہتے ہیں کہ یہ کہنا جناب محمد حنفیہ کا کہ "اُس مسجد کے اندر کی جگہ میں" بتلا رہا ہے کہ اُس وقت اُن کی قبر پر مسجد تھی جس میں قبر کا عام طور پر لوگوں کو علم تھا۔ محمد حنفیہ کی وفات سن ۸۱ھ میں ہے، اس لیے جناب محمد حنفیہ کی یہ روایت بتا رہی ہے کہ پہلی ہی صدی میں جناب فاطمہ بنت اسد کی قبر پر مسجد کی تعمیر ہو گئی تھی۔

(۹)

جناب حمزہؓ کی قبر پر عمارت

وفاء الوفاء میں ہے کہ:

" عبدالعزیز نے کہا کہ زیادہ گمان ہمارے یہاں یہ ہے کہ مصعب بن عمیر اور عبداللہ بن جحش دفن ہوئے ہیں اُس مسجد کے نیچے جو حمزہؓ کی قبر پر بنی ہوئی تھی۔"

اور یہ عبدالعزیز دوسری صدی کے شخص ہیں جس کی صراحت سمہودی نے اس کے پہلے کی ہے اور لکھا ہے کہ آئندہ فصل میں حمزہ کی قبر کے ذکر میں عبدالعزیز بن مروان کی زبانی آئے گا کہ قدیم زمانے سے حمزہ کی قبر پر مسجد تھی اور یہ دوسری ہجری کا ذکر ہے۔

(۱۰)

جناب عباسؓ اور امام حسنؑ کی قبر کا قبہ

علامہ ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں امام محمد باقر علیہ السلام کے حال میں لکھا ہے کہ:

" آپ کی وفات سنہ ۱۱۷ھ میں ۸ ۵ برس کی عمر میں مثل اپنے والد بزرگوار کے زہر سے ہوئی۔ اور آپ کی والدہ اُن کے والد کے چچا امام حسنؑ کی بیٹی تھیں اور آپ باپ اور ماں دونوں طرف سے حضرت رسولؐ کی اولاد میں ہیں اور آپ بھی اپنے والد کے پاس امام حسنؑ اور جناب عباسؓ کے قبے میں جو جنت البقیع میں تھا دفن ہوئے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ عباس کی قبر پر قبہ سنہ ۱۱۷ھ میں موجود تھا اور محدث خواجہ پارسا

بخاری نے اپنی کتاب "فصل الخطاب" میں امام زین العابدین کے حال میں لکھا ہے کہ:

" آپ کی وفات مدینے میں سنہ ۹۵ھ میں ہوئی اور آپ کی عمر ۵۷ برس کی تھی اور آپ اس قبہ میں دفن ہوئے جس میں عباس اور آپ کے چچا حسنؑ دفن تھے، پھر اس میں آپ کے فرزند محمد باقرؑ اور اُن کے فرزند جعفر صادقؑ دفن ہوئے۔"

اور ابن خلکان نے آپ کے حال میں لکھا ہے کہ:

" آپ کی وفات سنہ ۹۴ھ میں ہوئی اور آپ اپنے چچا امام حسنؑ کے مقبرے میں اُس قبے میں دفن ہوئے جس میں عباس کی قبر تھی۔"

اسی طرح امام محمد باقرؑ کے حال میں لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی کے آخر میں عباس کی قبر پر قبہ موجود تھا۔

اس کے بعد یہ کہنا کہ " یہ بدعت تابعین کے بعد پیدا ہوئی ہے " حقیقت امر سے بے خبری یا تجاہل کا نتیجہ ہے بلکہ نجد کے قاضی القضاۃ عبداللہ ابن سلیمان بن بلیہد نے اس پر طرہ کر دیا ہے کہ اپنے مضمون میں جو "ام القریٰ" کے شمارہ روز جمعہ ۱۷ر جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۵ھ میں شائع ہوا ہے، لکھا ہے کہ:

" خیر القرون میں سننے میں نہیں آیا کہ یہ بدعت پیدا ہوئی ہو بلکہ یہ بدعت پانچ صدیوں کے بعد وجود میں آئی ہے۔"

یہ نہایت عجیب ادعا ہے جسے تاریخ بالکل جھوٹ ثابت کرتی ہے، کیونکہ تاریخ سے پانچ صدی کے بہت قبل سے قبوں کا وجود آپ کے سامنے آ چکا ہے اور سمہودی نے وفاء الوفاء میں لکھا ہے کہ:

" پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر کی عمارت کی دیواریں نیچی تھیں، عبداللہ بن زبیر نے نہایت استحکام کے ساتھ انھیں اونچا کرا دیا۔ پھر الو البختری

نے جو ہارون رشید کی طرف سے مدینے کا گورنر تھا سنہ ۱۹۳ھ میں اُس حجرے
کی چھت تعمیر کرائی۔ پھر متوکل نے حرمین کے گورنر اسحاق بن سلمہ کو سنہ ۲۴۳ھ میں
حکم دیا کہ وہ اس حجرے کو سنگِ مرمر سے مضبوط بنوا دے۔"

اور ابن خلکان نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے حالات میں خطیب بغدادی سے نقل کیا ہے جو سنہ ۳۹۲ھ میں پیدا ہوئے ہیں کہ:

"موسیٰ کاظمؑ مقابر شونیزیہ یعنی مقابر قریش میں قبّے سے باہر دفن ہوئے اور اُن
کی قبر وہاں مشہور ہے اور زیارت گاہِ خلق ہے، اور اس پر روضہ بنا ہوا ہے
اور قندیلیں وہاں آویزاں ہیں اور طرح طرح کے سامان اور بے انتہا فرش فروش
ہے۔"

اس میں یہ الفاظ کہ "قبّے سے باہر دفن ہوئے" یہ بتاتے ہیں کہ ایک قبّہ وہاں آپ کے دفن ہونے سے پہلے موجود تھا اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی وفات سنہ ۱۸۳ھ میں ہوئی ہے اور اس وقت مقابر قریش میں قبّہ موجود تھا۔ اور پھر امام موسیٰ کاظمؑ کا روضہ خطیب کے زمانے سے پہلے بن چکا تھا۔ تو زیادہ سے زیادہ اُسے چوتھی صدی ہجری کے درمیان میں ماننا پڑے گا۔

اور جمال الدین ابن عنبہ نے "عمدۃ الطالب" میں لکھا ہے کہ:

"ہارون الرشید نے حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی
قبر پر قبّہ تعمیر کرایا تھا۔"

اور ایسا ہی "حبیب السیر اور کامل ابن اثیر" وغیرہ میں ہے اور حسین بن حجاج شاعر جن کی وفات سنہ ۳۲۷ھ میں ہے، اُن کے ایک قصیدے کا مطلع اس مضمون کا ہے کہ:

"اے نجف میں چمکتے ہوئے قبّے والے! جو آپ کی قبر کی زیارت کرے اور
شفا طلب کرے، وہ شفا پائے گا۔"

اور ابن خلکان نے ابو تمام حبیب بن اوس طائی (شاعر) کے حالات میں لکھا ہے کہ:

"اُن کی وفات سنہ ۲۳۱ھ میں ہوئی اور اُن کی قبر پر نہشل بن حمید طوسی نے قبّہ
تعمیر کیا۔"

اسی طرح بوران بنت حسن بن سہل کے قبّے کا ذکر کیا ہے جن کی وفات سنہ ۲۷۱ھ میں ہوئی ہے۔
اسی طرح عضد الدولہ دیلمی کے حال میں لکھا ہے جن کی وفات بھی سنہ ۲۷۱ھ میں ہوئی ہے کہ:

"وہ پہلے اپنے گھر میں دفن ہوئے۔ پھر امام موسیٰ کاظمؑ کے حرم کی طرف منتقل کر
گئے جو مقابر قریش میں ہے۔"

ابن دکیع شاعر کے حال میں لکھا ہے جن کی وفات سنہ ۳۹۳ھ میں ہوئی کہ:

"وہ بڑے قبرستان میں دفن ہوئے اُس قبّے میں جس کی تعمیر وہاں اُن کے
لیے ہوئی۔"

اور عثمان بن مدوخ شافعی نے اپنی کتاب "العدل الشاهد فی تحقیق المشاهد" میں سید ابراہیم حسین کے روضے کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"یہ روضہ قاہرہ سے باہر خندق کے قریب ہے اُس کے اور مطریہ کے بیچ میں اور
مسجد تبر الاخشیدی کے نام سے مشہور ہے اس لیے کہ انھوں نے اُسے سید ابراہیم
کی قبر پر بنوایا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ تبر اخشیدی کی وفات سنہ ۳۶۰ھ میں ہوئی۔"

روضۃ الصفا سے پتہ چلتا ہے کہ مامون خلیفۂ عباسی نے اپنے باپ ہارون رشید کی قبر پر قبّہ بنوایا تھا اور یہ سنہ ۲۰۳ھ کے قبل کی بات ہے چنانچہ امام رضا علیہ السلام کے حال میں ابو الصلت ہروی کی روایت درج ہے، اُن کا بیان ہے کہ:

"میں ایک دن امام رضاؑ کے پاس تھا۔ آپ نے فرمایا اُس قبّے کی طرف
جاؤ جس میں ہارون رشید کی قبر ہے اور تھوڑی سی مٹی وہاں کی لے آؤ۔ ان

کا بیان ہے کہ میں گیا اور لے آیا تو آپ نے اُسے سونگھا اور پھر پھینک دیا۔ فرمایا بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے کہ میرے لیے وہیں قبر کھودی جائے۔"

سب کو معلوم ہے کہ یہ خلیفہ مامون العباسی خود اہل علم میں سے تھا جیسا کہ سیوطی کی تاریخ الخلفاء میں ہے کہ مامون عدل و انصاف کا پابند، علم فقہ کا ماہر اور بڑے علماء میں اس کا شمار تھا۔ پھر دوسرے علماء بھی اس زمانے میں بکثرت موجود تھے جن میں امام شافعی، احمد بن حنبل اور سفیان بن عیینہ ایسے لوگ تھے مگر کسی نے قبے کی تعمیر میں اظہار اختلاف نہیں کیا۔

اس مختصر کتاب میں اتنے شواہد کا درج کرنا کافی ہے۔ جو شخص پورے طور پر تلاش کرے اُس کو مزید شواہد اس کے بکثرت ملیں گے۔

اجماع، یہاں ہم اُس اصطلاح کے مطابق اسے دیکھیں گے جو اہل سنت کی ہے۔ یعنی مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت کا اتفاق رائے۔ یہ قبور کی تعمیر کی موافقت اور مسلمانوں کی رائے عامہ ان عمارتوں کے بقاء اور احترام پر متفق رہی۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے جسے حافظ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ جب متوکل نے امام حسین علیہ السلام کے روضے کو منہدم کرایا اور اس سے بھی یہ ظاہر ہے کہ تیسری صدی میں آپ کی قبر پر عمارت تھی اور اس کے گرد اور بھی عمارتیں تھیں جنھیں متوکل نے منہدم کرا کے کھیتی کرادی اور لوگوں کو زیارت سے روک دیا اور متوکل کا ناصبی یعنی دشمن اہلِ بیتؑ ہونا عام طور پر مشہور تھا تو مسلمانوں کو اس سے بڑا صدمہ پہونچا اور بغداد کے باشندوں نے اُس کے خلاف نعرے دیواروں پر لکھ دئے اور شعراء نے اُس کی مذمت میں اشعار کہے جن میں سے بعض سیوطی نے نقل بھی لیے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ عام مسلمان جنھیں "جمہورِ اُمت" کہا جانا چاہیے، اس عمارت کے احترام پر متفق تھے۔

اور اکثر علماء نے اس کے مطابق تصریح کی ہے چنانچہ صاحب درّ المختار نے لکھا ہے کہ:

" عمارت بنانے میں اختلاف ہے۔ ہمارا مختار یہ ہے کہ اس کوئی مضائقہ نہیں۔"

اور ملا علی قاری نے شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ:

" سلفِ صالحین نے مستحسن سمجھا ہے عمارت بنانے کو مشائخ اور مشہور علماء کی قبروں پر تاکہ لوگ ان کی زیارت کو جائیں اور ان عمارتوں میں ٹھہر کر آرام پائیں۔"

اور ایسا ہی محدث محمد طاہر فتنی نے مجمع البحار میں لکھا ہے اور دوسرے علماء کے اقوال بھی اسی کے مطابق ہیں۔

اس کے بعد علمائے مدینہ کا یہ قول غلط ہو جاتا ہے کہ قبور پر عمارت بنانا اجماعاً ممنوع ہے اس لیے کہ وہ احادیث جو اسے رد کرتے ہیں صحیح السند نہیں مگر معلوم ہو گیا کہ اجماع اور اُن احادیث کا ادعا بالکل بے بنیاد ہے۔

اُن کا یہ کہنا کہ اکثر علماء نے فتوےٰ دیا ہے کہ ان عمارتوں کا منہدم کرنا واجب ہے حضرت علیؑ کی حدیث کی بنا پر کہ آپ نے ابوالہیاج سے یوں فرمایا۔ ہم جہاں تک کتابوں پر نظر ڈالتے ہیں، ہمیں یہ علماء نظر نہیں آتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام علماء صرف نجد کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی ہر زمانے کے علماء تو تمام تیرہ صدیوں میں ان عمارتوں کو دیکھتے رہے اور کبھی اُن کے منہدم کرنے کا فتوےٰ نہیں دیا، سوا ابن تیمیہ اور ابن قیم کے جو جمہور علماء کی مخالفت کا نشانہ رہے اور رسوائے زمانہ ہوئے۔ اس کے برخلاف تمام علماء کے سکوت اور تائید کے ساتھ تمام مسلمان ان عمارتوں کی تجدید اور استحکام کی طرف متوجہ رہے۔

ابوالہیاج والی حدیث سے جو یہ لوگ استناد کرتے ہیں وہ باطل ہے کئی وجوہ سے۔

اوّل یہ کہ یہ حدیث کفار و مشرکین کے قبور سے متعلق ہے جن کے وجود سے کوئی دینی فائدہ نہیں بلکہ مضرت کا اندیشہ ہے۔ لیکن انبیار و صالحین کے قبور کی بقار میں دینی فوائد ہیں جو پسندیدہ خالق ہیں جیسے زیارت ان قبور کی جس کے لیے حکم بھی ہوا ہے کہ قبروں کی جاکر زیارت کرو کہ اُن سے آخرت کی یاد تازہ ہوتی ہے اور پھر اُن کارناموں کی یاد تازہ ہوتی ہے جو ان حضرات نے اشاعتِ دین اور خدا کی راہ میں کیے تھے اور قبور کفار سے اس حدیث کے تعلق ہونے کا قرینہ خود حدیث میں موجود ہے، اس لیے کہ ایک ساتھ دو چیزوں کے محو کرنے کا حکم ہوا۔ ایک مورتیاں اور دوسرے اونچی قبریں اور ظاہر ہے کہ یہ مورتیاں مسلمانوں کی تعمیر کردہ نہیں تھیں بلکہ مشرکین کی بنا کردہ تھیں تو یہ قبریں بھی انہی کی ہوں گی۔

اور یہ درایتہً بھی ظاہر ہے کیونکہ مسلمان اُس دور میں مالی حیثیت سے کہاں اتنے مطلق تھے کردہ قبروں پر عمارتیں تعمیر کراتے اور صحابہ شرف صحبت کے لحاظ سے سب برابر کی حیثیت رکھتے تھے لہٰذا ان میں کچھ افراد کو ایسی امتیازی خصوصیت حاصل نہ تھی کہ ان کی قبر پر عمارت تعمیر ہوتی لہٰذا وہ قبور جن کے مٹانے کا حکم ہوا تھا ہرگز مسلمانوں کی قبریں نہ تھیں، ورنہ اُن پر سابق خلفار کے دور میں عمارتیں کیوں تعمیر ہوئیں جو اب جناب امیر علیہ السلام کو اُن کے منہدم کرانے کی ضرورت ہوتی۔ اور پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حکم کا آپ نے حوالہ دیا کہ مجھے اس مہم کے لیے بھیجا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دور میں مومنین کے قبور پر یہ عمارتیں کیونکر بن گئیں اور خود حضرتؐ کو بوقت تعمیر خبر نہ ہوئی جو بعد میں اُن کے گرانے کے لیے حضرت علیؑ کو بھیجا؟

اب یہ کہ وہ انبیار سلف کی قبریں ہوں تو ایسا بھی نہیں تھا۔ ایک تو وہ مدینہ اور اُس کے اطراف میں نہ تھیں بلکہ شام و فلسطین وغیرہ میں تھیں یا عراق میں تھیں اور

پھر اگر اُن قبروں کے انہدام کو بھیجا تھا تو وہ بعد میں باقی کیونکر رہیں جو تمام اطرافِ ارض میں منتشر ہیں جیسے جناب دانیالؑ کی قبر شوستر میں اور جناب ہودؑ اور صالحؑ اور جناب یونسؑ اور ذی الکفلؑ اور یوشعؑ کے قبور نجف اور سرزمین بابل میں اور بہت سے انبیار کے قبور شام اور فلسطین میں۔

اور سنیئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مادرِ گرامی جناب آمنہ بنت وہب کی وفات کب ہوئی تھی؟ جب حضرتؐ کی عمر مبارک ۶ برس کی تھی اور چالیس ۴۰ برس کی عمر میں حضرتؐ مبعوث برسالت ہوئے یہ چونتیس ہوگئے۔ پھر تیرہ برس کے بعد ہجرت ہوئی۔ اب ہوئے سنتالیس ۴۷ برس۔ پھر ۸ھ میں فتح مکہ ہوئی۔ یہ پچپن ۵۵ برس یعنی آدھی صدی سے زیادہ کا زمانہ گزر گیا اور اُس وقت تک جناب آمنہ کی قبر نمایاں تھی۔ مگر رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس کے گرانے یا مٹانے کا حکم نہیں دیا بلکہ خالق سے اُن کی قبر کی زیارت کے لیے اجازت حاصل فرمائی اور خداوند عالم نے حضرتؐ کو اس کی اجازت دی اور آپ کچھ اصحاب کی معیت میں وہاں زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ سرہانے بیٹھے اور سر مبارک کو اس طرح جنبش دے رہے تھے جیسے کچھ باتیں کر رہے ہیں اور پھر گریہ فرمایا جس پر تمام حاضر الوقت مسلمان جو سب صحابہ تھے گریہ کرنے لگے۔ اس کا ذکر صحیح مسلم میں بھی موجود ہے۔

پھر اس کا بھی ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ آپؐ کے فرزند جناب ابراہیم کی قبر بھی مکان کے اندر تھی اور وہ قبر خود حضرتؐ نے بنوائی تھی۔ یہ مکان بھی حضرتؐ کے دور میں اور اس کے بعد برابر باقی رہا۔

اس کے بعد خود حضرتؐ کی قبر مبارک عمارت کے اندر ہوئی جسے خود حضرت علی بن ابی طالبؑ اور دیگر اہل بیت اور صحابہ نے بنوایا اور وہ عمارت بھی برابر باقی رہی بلکہ اُس کے استحکام اور عمارت کی شان میں اضافہ کیا جاتا رہا اور اس کے بعد جناب عباس عم رسولؐ

کی قبر پر قبّے کی تعمیر بھی اسی دور میں ہوئی جو حضرت امیرؑ کے دورِ حکومت کے قبل کا تھا اور یہ قبّہ بھی اس کے پہلے اور اس کے بعد برابر قائم رہا۔

اس سب سے ظاہر ہے کہ یہ منہدم کرنے کا حکم اگر تھا تو وہ قطعاً کفار و مشرکین کے قبور سے متعلق تھا اور مقربین و صالحین کے قبور میں امتیاز خاص کا ہونا مرتکزات نفوس اہلِ اسلام میں سے تھا چنانچہ اصابہ حافظ ابن حجر میں محمد بن شرجیل کے حال میں ہے کہ خود اُن کا بیان ہے کہ:

"میں نے سعد بن معاذ کی قبر کی تھوڑی سی خاک مٹھی میں لے کر سونگھی تو اس میں سے مشک کی خوشبو محسوس کی۔"

اب جبکہ وہ حکم انہدام درصورتیکہ اُس حدیث کے معنی یہی ہوں کفار اور مشرکین کے قبور سے متعلق تھا تو اُس سے ائمہ دین اور مومنین صالحین کے قبور کے انہدام پر استدلال کرنا بالکل غلط ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "جو قبر اونچی دیکھو اُسے برابر کر دو" اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ خود قبر اونچی ہو جیسے عیسائیوں کی قبریں ہوتی ہیں یا خود مسلمانوں کے ایک طبقے میں کوہانِ شتر کی طرح اوپر اٹھی ہوئی قبریں بنائی جاتی ہیں تو اُن قبروں کو اوپر سے منہدم کر کے برابر کر دینے کا حکم ہو لہٰذا اس حکم کی زد اُن قبروں پر نہیں پڑتی جو مسطح بنائی گئی ہوں لیکن ان کے گرد عمارت بنا دی گئی ہو یا قبّے کی تعمیر کی گئی ہو جیسا کہ ائمہ دین اور صالحین و مقربین کے قبور ہوتے ہیں۔ حدیث کا تعلق اُن قبور سے نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خود قبور کی ساخت میں اختلاف ہے۔ اہل سنّت کی اکثریت کوہانِ شتر کی طرح اونچی بناتی ہے لیکن فقہ امامیہ میں جس کی بنا ائمہ اہل بیتؑ کے تعلیمات پر قائم ہے جو اپنے جدِّ بزرگوار حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پہونچائے ہوئے شرع الٰہی کے احکام سے زیادہ واقف تھے اور نیز فقہ شافعی میں قبر کو مسطح بنانا چاہیے۔ یہ حدیث

اس سے متعلق ہے۔ اس لیے ہمارے ایک بڑے محدث شیخ حر عاملی علیہ الرحمہ نے حدیث کی اپنی بڑی مبسوط کتاب "وسائل الشیعہ" میں اُسے "تسطیح قبر" کے باب میں درج کیا ہے اور محدث نووی نے بھی جو بڑے علمائے اہل سنّت میں سے ہیں یہی مطلب سمجھا ہے۔ چنانچہ شرح صحیح مسلم میں اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:

"سنت یہ ہے کہ قبر زمین سے زیادہ اونچی نہ ہو اور اُسے کوہانِ شتر کی طرح کا نہ بنایا جائے بلکہ بس ایک بالشت اونچی رکھی جائے امام شافعی اور اُن کے ہم خیال علماء کا مسلک ہے۔"

اور قسطلانی نے بھی شرح صحیح بخاری میں اُسے قبروں کے مسطح بنانے کے دلائل میں درج کیا ہے اور کہا ہے کہ اُس حدیث میں قبور کے برابر کرنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انھیں زمین کے برابر کر دیا جائے بلکہ اُس کا مطلب یہ ہے کہ انھیں مسطح کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ سوّیتہ کی لفظ جو تسویۃ سے ہے، اس کے ساتھ اگر کسی چیز کا نام لیا جائے تو معنی اُس شے سے برابر کرنے کے ہوں گے لیکن جب کسی دوسری چیز کا نام نہ لیا جائے تو اُس کے معنی یہ ہوں گے کہ بس اپنی جگہ اُس شے کو معتدل اور مسطح بنا دیا جائے چنانچہ فیتومی نے مصباح المنیر میں لکھا ہے کہ استوی المکان کے معنی یہ ہیں کہ یہ جگہ معتدل و متوازن ہو گئی اور سویتہ کے معنی ہیں کہ میں نے اُسے معتدل و متوازن بنا دیا اسی طرح قاموس میں ہے۔ اگر وہ معنی ہوتے تو سویتہ بالارض کہا جاتا جیسے قاموس نے کہا ہے کہ سویتہ بہ تسویۃ اور سویت بینھما اور ساویت او اسویتہ بہ اس سب کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اس کو اُس دوسرے کے برابر کر دیا۔ یہاں صرف سویتہ ہے تو اس کے معنی وہی ہیں کہ جو علماء نے سمجھے ہیں کہ قبر کی بیچ والی اونچائی کو ختم کر کے اُسے مسطح کر دیا جائے۔

اگر قبر کو زمین کے بالکل برابر کرنے کا حکم ہوتا تو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے

عثمان بن مظعون کی قبر کو زمین سے ذرا اونچا کیوں رکھا جس کی صراحت حدیث میں موجود ہے۔ اور ایک حدیث ابھی آئے گی جس میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ قبر سے تکیہ لگائے بیٹھا ہے اور تکیہ لگانا ممکن ہی نہیں جب تک کہ قبر زمین سے کچھ نہ کچھ اونچی نہ ہو۔

اس تعمیر کے شعبے سے متعلق ایک چیز ہے قبر پر سایہ کرنا جس کی ممانعت بھی کچھ وہابی افراد کی زبانی گوش زد ہوئی ہے حالانکہ اس کا بھی وقوع اسی دور میں جو خیر القرون تھا نظر آیا ہے۔ چنانچہ اصابہ حافظ ابن حجر میں ثعلبہ بن مالک کی روایت ہے کہ:

"حکم بن ابی العاص کی دور خلافت عثمان میں موت ہو گئی اور گرمی اس دن شدت سے تھی تو قبر پر ایک خیمہ نصب کیا گیا۔ کچھ لوگوں نے اس پر "چہ می گوئی" کرنا شروع کی تو جناب عثمان نے کہا کہ عمر کے زمانے میں زینب بنت جحش کی قبر پر خیمہ لگایا گیا تو اس وقت کسی نے اعتراض نہیں کیا۔"

حکم کی موت ۳۲ھ میں ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ تفسیر روح المعانی میں ہے کہ جناب محمد حنفیہؓ نے جناب ابن عباسؓ کی قبر پر خیمہ لگوایا اور صحیح بخاری میں ہے کہ جب حسن بن حسنؑ کی وفات ہوئی تو اُن کی زوجہ مکرمہ (فاطمہ بنت الحسین) نے اُن کی قبر پر خیمہ نصب کیا اور وہاں ایک سال قیام کیا۔

یہ کہنا کہ "قبروں کو مسجد بنانا اور اُن میں نماز' یہ بھی ممنوع ہے" اس کا مستند شاید رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی یہ حدیث ہو کہ اللہ یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنایا مگر اس حدیث کا صحیح مطلب وہ ہے جیسے محدث طاہر فتنی نے مجمع البحار میں لکھا ہے کہ:

"وہ لوگ ان قبروں کو قبلہ بنا کر اُن کی طرف ہر نماز میں مثل بتوں کے

سجدہ کرتے تھے۔"

اور حافظ سیوطی نے اپنی کتاب "زہر الربیٰ" میں اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ:

"جب ان میں کوئی نیک آدمی مرتا تھا تو اس کی قبر پر مسجد بناتے تھے۔"

بیضاوی نے لکھا ہے کہ:

"چونکہ یہود و نصاریٰ اپنے پیغمبروں کی قبروں کا سجدہ کرتے تھے اور انہیں قبلہ بنا کر اُن کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور انھیں بُت بنا لیا تھا اس لیے اُن پر لعنت کی گئی اور مسلمانوں کو روکا گیا کہ وہ ایسا نہ کریں لیکن اگر کوئی شخص کسی نیک آدمی کی قبر کے پاس مسجد بنائے صرف حصول برکت کے لیے اور اس کی طرف رُخ کر کے نماز نہ پڑھے تو وہ اس میں داخل نہ ہوگا۔"

علامہ سندی مدنی حاشیہ سنن نسائی میں لکھتے ہیں کہ:

"حضرتؐ کا مقصود یہ تھا کہ اپنی اُمت کو ڈرائیں اُس سے جو یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کے ساتھ کیا تھا کہ انھیں مسجد بنا لیا یا تو اس طرح کہ اُنہی کو سجدہ کرنے لگے یا انھیں قبلہ بنا لیا کہ نماز وغیرہ میں اُنہی کی طرف رُخ کرنے لگے لیکن اگر جوار قبر میں حصول قبر کے لیے مسجد بنائے تو وہ ممنوع نہیں ہے۔"

پہلے اسی کتاب میں قبر پر مسجد کی تعمیر کے شواہد درج ہو چکے ہیں جیسے اصحاب کہف پر مسجد کی تعمیر اور فاطمہ بنت اسد کی قبر پر مسجد کا جناب محمد حنفیہ کے سامنے وجود اور دوسری صدی میں جناب حمزہ کی قبر پر مسجد کا موجود ہونا اور یہاں مزید اضافہ اس پر یہ ہے کہ "کنوز الحقائق مناوی" میں دیلمی کی روایت ہے کہ:

"مسجد خیف میں ستر نبی دفن ہیں۔"

اور ایک مقام پر اس کی روایت طبرانی سے ہے۔ اس سے ابن قیم کے اس دعوے کی رد

ہوجاتی ہے کہ دینِ اسلام میں مسجد اور قبر یکجا نہیں ہوسکتے بلکہ جو بعد میں ہو اُسے روک دیا جائے اور پہلے والے کو باقی رکھا جائے اور سب سے بڑی مثال دونوں کے یک جا ہونے کی مسجد الحرام کے اندر حجرِ اسمٰعیل میں جناب اسمٰعیل اور ہاجرہ کی قبر کا وجود ہے۔

ایک اور معنی اُس حدیث کے یہود اور نصاریٰ نے اپنے انبیاء کے قبور کو مسجد بنا لیا، وہ ہیں جو امام بخاری نے سمجھے ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ یہود اور نصاریٰ نے اپنے انبیاء کے قبور کو کھود ڈالا اور اُن کی جگہ پر مسجدیں بنا دیں تو رسولؐ نے اُن پر لعنت کی ہے پیغمبروں کی توہین کی وجہ سے چنانچہ اُنھوں نے اپنی صحیح میں عنوان قائم کیا ہے کہ مشرکین جاہلیت کی قبروں کو کھود ڈالا جائے اور ان کی جگہ پر مسجدیں بنادی جائیں، اس کے ثبوت میں اُنھوں نے یہ حدیث درج کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود و نصاریٰ پر لعنت کی اس بات پر کہ اُنھوں نے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنایا۔ صاحب فتح الباری نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ:

"اس حدیث سے کفار کے قبور کو مسجد بنانے پر استدلال اس بنا پر ہے کہ رسولؐ نے اُن پر لعنت فرمائی جنھوں نے انبیاء کے قبور کو مسجد بنایا اور انبیاء کے ساتھ اس حکم میں اُن کے تابعین شریک ہیں جو مومنین صالحین ہیں لیکن دوسرے لوگ یعنی مشرکین، اُن کے قبرستانوں کو کھود کر مسجد بنایا جاسکتا ہے۔"

حدیث کا یہ مفہوم ہو تو وہ وہابی نقطۂ نظر کے بالکل خلاف ہے، اس لیے انبیاء کے قبرستانوں کو کھود کر مسجد بنانے پر لعنت جب انبیاء کی توہین کی بنا پر ہوئی ہے تو بغیر مسجد بنائے ہوئے بلا وجہ بلکہ بطورِ ظلم و فساد اُن کے مقبروں کا کھودنا جو یقیناً اُن کی توہین ہے، کیونکر موردِ لعنت نہ ہوگا؟!

مقبروں میں نماز، اس کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ جمہور علماء کراہت کے

قائل ہیں۔ وہابیوں کا جو نقطۂ نظر ہے، اُس کے خلاف اہل بیت کرام اور صحابہ کا عمل موجود ہے چنانچہ غزالی نے احیاء العلوم میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت لکھی ہے کہ حضرتِ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا جناب حمزہؓ کی قبر کی زیارت کو جاتی تھیں اور وہاں نماز پڑھتی تھیں اور روتی تھیں۔ اس کے علاوہ حجرِ اسمٰعیل میں جناب اسماعیل اور ہاجرہ کی قبروں کے ہوتے ہوئے، وہاں نماز کی فضیلت وارد ہوئی ہے اور ابن اثیر نے نہایہ میں لکھا ہے کہ:

"مقبروں میں نماز سے ممانعت اس لیے ہوئی ہے کہ وہاں کی خاک میں اکثر مُردوں کے جسم سے نکلی ہوئی رطوبتیں ملی ہوئی ہوتی ہیں۔ ورنہ اگر کسی پاک صاف جگہ نماز پڑھے تو کوئی حرج نہیں ہے۔"

ایسا ہی محدث فتنی نے "مجمع البحار" میں لکھا ہے اور اتنا اضافہ کیا ہے کہ:

"یہ ممانعت مخصوص ہے اُن قبروں سے جو کھدی ہوئی ہوں۔"

اس کے علاوہ قبروں کے پاس نماز کی ممانعت میں اگر اس حدیث سے استدلال کیا جائے کہ قبروں کو مسجد نہیں بنانا چاہیے تو اس کے مفہوم پر کافی بحث ہوچکی ہے اور اس کا ثبوت ابن حبان کی صحیح سے بھی ہوتا ہے کہ اُس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبروں کی طرف نماز پڑھنے سے ممانعت فرمائی ہے اور امام احمد بن حنبل نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا قبروں پر بیٹھو نہیں اور قبروں کی طرف نماز نہ پڑھو۔

اس کے بعد اُن احادیث کے مفہوم میں شک و شبہ باقی نہیں رہتا اور نیک اعمال افراد کی قبروں کے پاس نماز حصولِ برکت کے لیے برابر سلف صالحین میں جاری و ساری رہی جس کی تقویت اس حکمِ قرآنی سے ہوتی ہے کہ

"ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو اپنی نماز کا محل بناؤ"

اور عبداللہ بن عمر حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آثار کی جستجو کرتے تھے اور وہاں نمازیں پڑھتے تھے اور ابن تیمیہ حنبلی نے "صراط مستقیم" میں لکھا ہے جیسا کہ "اوراق بغدادیہ" میں نقل ہوا ہے کہ سندی خوارزمی کا بیان ہے کہ

"ہم نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ کوئی شخص ان متبرک مقامات پر جو بنے ہوئے ہیں جائے، اس باب میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ انھوں نے کہا ابن ام مکتوم کی حدیث ہے، انھوں نے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ وہ اپنے گھر میں نماز پڑھا کریں کہ وہ ایک مرکز نماز کا ہو جائے اور ابن عمر کا عمل کہ وہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ٹھہرنے کے مقامات پر جاکر نمازیں پڑھتے تھے، ان دونوں روایتوں کی بنا پر ان متبرک مقامات پر بھی جاکر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر لوگوں نے اس میں افراط سے بہت کام لیا ہے اور اس میں بہت زیادتی کر دی ہے۔"

اسی طرح احمد بن قاسم نے اُن سے نقل کیا کہ ان سے پوچھا گیا ان مقامات متبرکہ پر جانے کے متعلق جو مدینۂ طیبہ میں ہیں تو اُنھوں نے کہا کہ

"ابن مکتوم کی حدیث اور عبداللہ بن عمر کے عمل کی بنا پر جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لے جانے کے مقامات پر نمازیں پڑھتے تھے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اُس کی اجازت ہے۔"

کتاب "الاعلام لاعلام بیت اللہ الحرام" میں جناب خدیجہؓ کے مکان کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اُسے عقیل بن ابی طالب نے لے لیا۔ پھر اُن سے معاویہ بن ابی سفیان نے خریدا اور اُسے مسجد بنا دیا کہ اس میں نماز پڑھی جائے۔

معلوم ہوا کہ انبیاء اور صالحین کے روضوں پر نماز پڑھنا شرعاً جائز ہے اور اس کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ سیرت اسلاف صالحین اُس کے استحسان کا پتہ دیتی ہے۔"

یہ کہنا کہ چراغ جلانا قبروں پر ممنوع ہے ابن عباسؓ کی روایت کی بنا پر کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت کی قبروں کی زیارت کرنے والیوں اور انھیں مسجد بنانے والوں اور چراغ جلانے والوں پر، اس کے متعلق عرض ہے کہ چراغ جلانا اگر بغیر کسی صحیح مقصد کے ہو تو اس کی ممانعت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ زائرین کی سہولت اور تلاوتِ قرآن کرنے والوں، اَدعیہ و زیارات پڑھنے والوں کے لیے ہے تو وہ اعانت علی الخیر ہے۔ ان پر ہرگز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لعنت متوجہ نہیں ہو سکتی اور زیارتِ قبور والی ممانعت کے متعلق تحفۃ الباری اور ارشاد الساری وغیرہ میں ہے کہ وہ بعد میں منسوخ ہو گئی اور قبور کے مسجد بنانے کے مفہوم پر بحث پہلے ہو چکی ہے۔ مسح اور دُعا کے بارے میں شواہد بھی پہلے آ چکے ہیں۔ مزید براں یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے "صراطِ مستقیم" میں لکھا ہے کہ ابوبکر اثرم نے روایت کی ہے کہ

"میں نے احمد بن حنبل سے قبرِ رسولؐ کے ساتھ مسح کے بارے میں پوچھا۔ اُنھوں نے کہا مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔ پھر منبر کے لیے دریافت کیا، انھوں نے کہا اس کے لیے روایت آئی ہے کہ عبداللہ بن عمر منبر سے مسح کرتے تھے اور سعید بن مسیّب کا عمل بھی بیان ہوا ہے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ امام احمد بن حنبل نے بھی قبرِ رسولؐ کے لیے یہ جرأت نہیں کی کہ اُس سے مسح کو حرام قرار دیں۔ بس اپنی لاعلمی کا اظہار کیا حالانکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جب منبر سے مسح کا شاہد مل گیا تو قبرِ رسولؐ تو منبر سے زیادہ قابلِ احترام ہے اور قبر کے بارے میں جو ان کا قول بیان کیا گیا ہے کہ مجھے اُس کے متعلق علم نہیں ہے، یہ بظاہر اس راوی کا سہو ہے یا یہ کہ یہ شخص قابلِ اعتماد نہ تھا، اس لیے امام احمد نے اُس سے کھل کر گفتگو نہیں کی۔ اس لیے کہ جیسا علامہ سید حسن صدر طاب ثراہ نے اپنے رسالے میں نقل کیا ہے امام احمد بن حنبل کے بیٹے عبداللہ بن احمد نے جن کا قول ظاہر ہے کہ اپنے والد کے بارے میں

زیادہ معتبر ہے، "کتاب العلل والسؤالات" میں لکھا ہے کہ:

"میں نے اپنے والد سے اس شخص کے متعلق پوچھا جو منبر رسولؐ کو تبرکاً چھوئے اور اُس کا بوسہ لے اور ایسا ہی قبر مبارک کے ساتھ کرے اس امید میں کہ اُسے ثواب ملے گا، انھوں نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں ہے۔"

نیز ابن تیمیہ نے یحییٰ بن سعید کی روایت درج کی ہے کہ جب وہ عراق کی طرف جانے لگے تو منبر رسولؐ کی طرف آئے اور اُنے ہاتھ سے چھوا اور دعا مانگی۔ اور امام مالک سے نقل ہوا ہے کہ وہ منبر رسولؐ سے برکت حاصل کرتے تھے اور سبکی نے کہا ہے کہ قبر رسولؐ کے مسح سے ممانعت پر کوئی اجماع نہیں ہے۔ اور اس روایت سے استدلال کیا ہے کہ مروان بن حکم نے دیکھا کہ ایک شخص قبر رسولؐ سے لپٹا ہوا ہے تو مروان نے اُس کی گردن پکڑی اور کہا کہ یہ تم کیا کر رہے تھے؟ اُس نے کہا کہ میں پتھروں اور اینٹوں کی طرف نہیں آیا ہوں۔ میں رسولؐ کی خدمت میں آیا ہوں اور یہ شخص جناب ابو ایوب انصاری تھے اور ایسا ہی بلال موذن رسولؐ کے متعلق آیا ہے کہ اُنھوں نے اپنا منہ قبر رسولؐ کی مٹی سے ملا اور یہ عمل صدر اسلام سے برابر مسلمانوں میں رائج رہا۔

ذبح اور نذر بے شک اگر خدا کا نام لے کر نہ ہو اور قصد قربتِ الٰہی سے نہ ہو تو ہم بھی اُس ذبیح کو حلال نہیں سمجھیں گے۔ اور نہ نذر کو درست سمجھیں گے لیکن اگر اللہ کا نام لے کر کسی روضے کے زائروں پر تقسیم کرنے کے لیے ذبح کرے تو اس میں کوئی خرابی معلوم نہیں ہوتی اور اسی طرح اگر اللہ سے نذر کرے اُس روضے کے زائرین کی کچھ خدمت کے متعلق تو اس کے بھی حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

یہ کہنا کہ دعا کے وقت روضۂ رسولؐ کی طرف رُخ کرنے کو روکنا بہتر ہے اور تمام سمتوں میں سب سے افضل سمت قبلہ ہے، یہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتبے سے ناواقفیت، یا چشم پوشی کا نتیجہ ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جو صحیح العقیدہ علماء ہیں جیسے علی بن برہان الدین شافعی "انسان العیون" اور حافظ جلال الدین سیوطی "خصائص کبریٰ" میں صراحتہً لکھتے ہیں کہ:

"قبرِ رسولؐ کی سرزمین اجماعاً تمام قطعات ارض یہاں تک کہ کعبے کی زمین سے بھی افضل ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آسمان کے بھی ہر مقام یہاں تک کہ عرش سے بھی افضل ہے۔"

اور توسل کی بحث میں قاضی عیاض کی روایت آچکی ہے کہ منصور دوانیقی نے امام مالک سے پوچھا کہ میں قبلہ رُخ دعا مانگوں کہ قبر رسولؐ کی طرف رُخ کر کے؟ تو انھوں نے کہا کہ

"اپنا چہرہ آپ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کیوں موڑیے حالانکہ وہ آپ کا بھی وسیلہ ہیں اور آپ کے باپ حضرت آدمؑ کا بھی وسیلہ ہیں۔"

اور علامہ محقق کمال بن ہمام نے صراحتہً کہا ہے کہ:

"قبر شریف کی طرف رُخ کرنا قبلہ کی طرف رُخ کرنے سے افضل ہے۔"

اور علامہ ابن حجر مکی نے "جوھر منظم" میں اس پر یہ دلیل قائم کی ہے کہ ہم سب متفق ہیں اس امر پر کہ:

"حضرتؐ اپنی قبر میں زندہ ہیں اور حضرتؐ اگر ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ بیٹھے ہوتے تو آپ کے پاس ملاقات کے لیے آنے والا لازماً آپ کی طرف رُخ اور قبلے کی طرف پشت کرتا تو ایسے ہی حضرتؐ کی قبر کی زیارت کے وقت ہونا چاہیے۔"

طواف اور مسح اور بوسہ لینے کے لیے جو کچھ کہا گیا ہے، اُس پر بحث پہلے آچکی ہے اور عبداللہ بن احمد بن حنبل کی زبانی خود امام احمد بن حنبل جن کی طرف ابن عبدالوہاب اور تمام نجدی حضرات

اور اُن کے مقتدایان ابن تیمیہ اور ابن قیم سب کا انتساب ہے، ان کا ارشاد آچکا ہے کہ قبرِ رسولؐ کا بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ موت کے بعد قبر کا بوسہ لینا ویسا ہی ہے جیسے زندگی میں ہاتھوں یا پیروں کا بوسہ لینا کیونکہ معیار دونوں کا ایک ہی ہے اور وہ عزت و احترام ہے۔ اور سنن ابو داؤد میں عبداللہ بن عمر کی زبانی ہے کہ ہم لوگ رسولؐ کے پاس گئے اور آپ کے ہاتھوں کا بوسہ لیا اور اُمّ ابان بنت وازع بن زارع کی روایت ہے اپنے دادا زارع سے جو قبیلۂ عبدالقیس کے وفد میں آئے تھے کہ جب ہم پہونچے تو اپنے مرکبوں سے جلدی جلدی اتر کے رسولؐ کے ہاتھوں اور پیروں کے بوسے لے رہے تھے۔ اس کے علاوہ تعظیمِ رسولؐ کے سلسلے میں بوسہ لینے کے دوسرے شواہد بھی پہلے آچکے ہیں۔

اب بحمداللہ

علمائے مدینہ کی طرف منسوب شدہ فتوے کے تمام اجزاء کے پرخچے اُڑ چکے ہیں اور ثابت ہوگیا ہے کہ قبور پر قبّوں کی تعمیر اور اُن کے تعظیم و توقیر کے حرام یا شرک ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ سیرتِ رسولؐ، سیرتِ صحابہ و تابعین اور تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے جو شروع سے اب تک رہا، جو ان عمارتوں کو منہدم کرے یا اس انہدام کا حامی ہو وہ باصطلاح اہلِ سنّت خارج از جماعت ہونے کی وجہ سے خارج از دین ہے۔

چھٹا باب

کچھ احادیث اور اخبار جو اہلِ نجد کے بارے میں ہیں

منجملہ اُن کے صحیح بخاری میں حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے وارد ہے کہ

"حضرتؐ منبر کے پہلو میں کھڑے ہوئے اور فرمایا ادھر سے فتنہ ہوگا جہاں سے شیطان کا سینگ برآمد ہوگا"۔

یا فرمایا کہ "سورج کی شعاع برآمد ہوتی ہے"۔

دوسری لفظوں میں تو بالکل صاف ہے کہ حضرتؐ کا اشارہ مشرق کی طرف تھا، ہاں پہلی صورت میں الفاظ حدیث کے مبہم ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہ حضرتؐ کا اشارہ کس طرف تھا؟ مگر اس کی تشریح دوسری حدیث سے ہو جاتی ہے جو عبداللہ بن عمر سے ہے کہ انھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو سنا جبکہ آپ مشرق کی طرف رُخ کیے ہوئے تھے کہ آپ فرماتے تھے معلوم ہونا چاہیے کہ فتنہ ادھر سے اُٹھے گا جدھر شیطان کا سینگ ہے۔ اس سے پتہ چل گیا کہ حضرتؐ کا اشارہ مشرق کی طرف تھا اور یہ سب کو معلوم ہے کہ مدینے سے مشرق کی طرف سرزمینِ نجد ہے۔

دوسری حدیث صحیح مسلم میں ہے کہ :

"دلوں کی سختی اور بے وفائی مشرق میں ہے اور ایمان اہلِ حجاز میں ہے"۔

حضرتؑ نے ان حدیثوں میں صاف بتادیا کہ اہلِ حجاز نسبتہً صاحب ایمان ہوتے ہیں اور نجد کے لوگ سخت دل اور بے رحم ہوتے ہیں مگران وہابیوں نے الٹا حکم لگا دیا ہے کہ نجدی ہی صرف صاحبان ایمان ہیں اور اہلِ حجاز اور تمام دنیا کے مسلمان کافر و مشرک ہیں۔ پھر اگر کسی کو شک رہے اس میں کہ شرق سے مراد نجد ہے بلکہ خیال کرتا ہو کہ کوئی اور ملک مراد ہے تو ایک اور حدیث میں جو صحیح بخاری میں ہے اس اجمال کو بالکل دور کر دیا گیا ہے۔ یہ ابن عمر کی روایت ہے کہ:

"حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے کہا پروردگارا! ہمارے شام میں برکت عطا فرما اور ہمارے یمن میں برکت عطا فرما۔ لوگوں نے کہا یہ بھی فرمادیجیے کہ ہمارے نجد میں برکت عطا فرما۔ حضرتؐ نے پھر وہی دونوں جملے کہے کہ ہمارے شام میں برکت عطا فرما اور ہمارے یمن میں برکت عطا فرما۔ لوگوں نے کہا یا رسولؐ اللہ اور ہمارے نجد میں بھی۔ راوی کا بیان ہے کہ مجھے خیال ہے کہ تیسری مرتبہ حضرتؐ نے جواب دیا کہ وہاں تو زلزلے ہیں اور فتنے اور وہاں سے شیطان کا سینگ برآمد ہوگا۔"

اس حدیث سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ سرزمین نجد شیطان کے غلبے کا مرکز ہے، وہاں یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ خدا و رسولؐ کو ناپسند ہے۔ اس لیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے باوجود اصرار اُسے اپنی دُعائے خیر میں شریک نہیں کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رحمتِ خدا اس سرزمین سے ہمیشہ کے لیے دور ہے۔ یہ حدیث کتب اہلِ سنت میں بھی ہے جیسا کہ حوالہ آپ کے سامنے آیا اور ہمارے علماء میں سے علامہ نوری نے بھی مستدرک الوسائل میں اُسے درج کیا ہے۔

ان احادیث میں قرن الشیطان کی لفظ ہے جس کے لفظی معنی تو وہی ہوئے جو ہم نے ترجمے میں لکھے ہیں یعنی "شیطان کا سینگ"۔ اس کے لیے "قاموس" میں ہے کہ

قرن الشیطان اور قرنا الشیطان یعنی "شیطان کا سینگ" اور "شیطان کے دونوں سینگ"۔ اس کے معنی ہیں اُس کا گروہ اور اس کی رائے کے پیرو یا اس کی طاقت اور اُس کا غلبہ و تسلط۔ گویا اہلِ نجد شیطان کے ہتھیاروں کی حیثیت رکھتے ہیں کہ اُنہی کے ذریعے سے وہ حملہ آور ہوتا ہے اور اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔

پھر ایک حدیث پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہے کہ:

"ایمان مدینے کی طرف پناہ لیتا ہے"

اسے ابن اثیر جزری نے نہایہ میں درج کیا ہے اور حضرتؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ:

"شیطان ناامید ہوچکا ہے کہ اب جزیرۃ العرب میں اُس کی عبادت نہیں ہوگی"

جس سے مکے اور مدینے کا مراد ہونا قدر متیقن کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ ابن اثیر نے نہایہ میں امام مالک کا قول درج کیا ہے کہ یہاں "جزیرۃ العرب" سے خود مدینۂ منورہ مراد ہے۔ تو اس کے بعد کتنا تعجب خیز یہ تصور ہے کہ جس سرزمین کو رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے شیطان کا مرکز کہا ہو، وہاں کے لوگ دعوے دار ہوں کہ ہم مومنین ہیں اور سچے مسلمان اور جن شہروں کے لیے فرمایا ہو کہ وہ ایمان کا مرکز ہیں اور وہاں شیطان کی پیروی اب نہیں ہوسکتی، انھیں سمجھا جائے کہ وہ سب کافر و مشرک ہیں۔

حیرت انگیز سخن پروری کا کرشمہ یہ ہے کہ نجدی حضرات آیاتِ قرآن اور بعض احادیث کی تاویل سے جو معقول وجوہ پر بھی مبنی ہو، شدت کے ساتھ انکار رکھتے ہیں اور انھیں اس پر اصرار ہے کہ الفاظ کو اُن کے ظاہری مفہوم پر محمول کرنا چاہیے لیکن جب یہ حدیثیں پیش کی جاتی ہیں تو وہ انتہائی دور دراز تاویلوں سے کام لے کر دھاندلی کر کے بتاتے ہیں کہ اس سے سرزمین نجد مراد نہیں بلکہ سرزمینِ عراق مراد ہے۔ اس لیے کہ وہ حجاز سے اُونچی سطح پر واقع ہے۔ لیکن لغت اور جغرافیہ اور اشعارِ عرب سب پر نظر کرنے سے یہ بات بعید از حقیقت معلوم ہوتی ہے

اور پتہ چلتا ہے کہ نجد کی لفظ جب بلا کسی قید کے بولی جائے تو اُس سے یہی سرزمین مُراد ہوتی ہے جو حجاز کے پاس اُس سے اُونچی ہے، اس لیے نجد کہلاتی ہے۔ اور اس کے مقابل میں تہامہ ہے اس لیے کہ وہ اُس سے نیچے ہے اور اُسے غور بھی کہتے ہیں، جو مقابل نجد ہوتا ہے۔

فیروز ابادی قاموس میں نجد کے معنی اور اُس کے حدود لکھتے ہیں کہ اُس کے آگے تہامہ اور یمن ہے اور اُس کے اِدھر اُدھر عراق اور شام ہے، اور حجاز کی طرف سے وہ ذات عرق سے شروع ہوجاتا ہے۔ اور جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ نجد عرب کے شہروں میں سے ہے اور وہ غور کے مقابل ہے اور غور سے مراد تہامہ ہوتا ہے اور تہامہ سے عراق تک بیچ میں جتنا اونچا حصہ ہے، وہ نجد ہے۔ اور فیومی نے "مصباح المنیر" میں لفظ نجد کی تشریح میں لکھا ہے کہ نجد مشہور ملک ہے سرزمین عرب میں سے عراق سے ملا ہوا اور وہ حجاز کا جز نہیں ہے۔ اگرچہ جزیرۃ العرب میں داخل ہے۔ تہذیب میں ہے کہ جو خندق کسریٰ نے عراق کی سرحد پر کھدوائی تھی، اُس خندق کے آگے جتنا حصہ ہے، وہ نجد ہے، جہاں تک کہ حرہ کی طرف مڑو۔ جب اُس طرف مڑ جاؤ تو حجاز میں داخل ہوگئے۔

اور محمود شکری آلوسی نے تاریخ نجد میں تقریباً دس قول نجد کی حدبندی میں درج کیے ہیں جو سب کے سب اس بات کے شاہد ہیں کہ سرزمین عراق نجد سے خارج ہے۔

شعرائے عرب نے بھی نجد کی لفظ سے اسی سرزمین کو مراد لیا ہے، نہ کہ سرزمین عراق کو، بلکہ عراق کا نام نجد کے مقابلے میں لیا ہے۔ وہ اشعار ہم نے اپنی عربی کتاب میں درج کیے ہیں۔ اس اُردو کتاب میں اُن کے نقل کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

"قاموس الامکنۃ والبقاع" میں ہے کہ "نجد کے شہر، حجاز کے مشرق میں واقع ہیں اور ان کے دو حصے ہیں: نجد حجاز اور نجد عارض اور اس سرزمین سے قرامطہ نے خروج کیا اور مسیلمۂ کذاب وہیں سے اٹھا اور وہابی لوگ وہیں سے برآمد ہوئے اور اُن کا

پائے تخت شہر "ریاض" ہے جس کی مردم شماری تیس ہزار کی ہے۔" اس سے صاف ظاہر ہے کہ نجد کی سرزمین وہی ہے جو وہابیوں کا مرکز ہے اور یہ حجاز کے مشرق میں ہے جس کے بعد اُن احادیث کے مطلب پر کوئی پردہ نہیں رہتا۔

من جملہ اُن احادیث کے ایک وہ ہے جسے احمد بن زین دحلان نے "خلاصۃ الکلام" میں درج کیا ہے کہ:

"حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا نجد سے ایک شیطان ظاہر ہوگا جس کے فتنے سے جزیرۃ العرب میں تہلکہ پڑ جائے گا۔"

ایک اور حدیث انھوں نے درج کی ہے کہ:

"مشرق کی طرف سے نکلیں گے ایسے جو قرآن اس صورت سے پڑھیں گے کہ وہ اُن کے گلوں کے آگے نہیں بڑھے گا۔ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔ وہ دین میں پھر واپس نہیں آئیں گے جب تک کہ تیر کمان میں واپس نہیں آتا۔ اُن کی خاص علامت سر کا منڈا ہوا ہونا ہے۔"

اور ایسے ہی مضمون کی دوسری روایتیں بھی ہیں۔

خلاصۃ الکلام میں ان تمام روایتوں کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ جو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ ان کی خاص علامت سر کا گھٹوانا ہے۔ یہ صراحتہً اُس جماعت کو ظاہر کر رہا ہے جو مشرق سے نکلی اور وہ محمد بن عبدالوہاب کی پیرو ہے۔ اور ابن عبدالوہاب کی تاکید تھی کہ وہ سر کو اس طرح گھٹوائیں کہ ذرا سا نشان بھی بال کا نہ رہ جائے اور کوئی آجاتا تو اُسے اٹھ کر جانے نہیں دیا جاتا تھا جب تک کہ اُس کا سر منڈ نہ جائے اور اتنی پابندی اس کی اس جماعت سے پہلے کسی بھی گروہ میں دیکھی نہیں گئی اور عبدالرحمٰن مفتی زبید کا قول تھا کہ ابن عبدالوہاب کی رد میں کسی کتاب کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ بس حضرتؐ کا یہ

ارشاد کافی ہے کہ اس جماعت کی علامت سر کا منڈانا ہے ۔ اس لیے کہ کسی بدعتی گروہ نے بھی کبھی اس پر اتنا زور نہیں دیا اور محمد بن عبدالوہاب کی طرف سے اس کی ایسی پابندی تھی کہ وہ عورتیں بھی جو اس مسلک کی پیرو ہوں، انھیں بھی سر کو منڈوانے کی ہدایت ہوتی تھی۔

منجملہ اُن کے ایک حدیث ہمارے بلند پایہ محدث علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار کی جلد فتن میں ابوسعید خدریؓ کی روایت سے درج کی ہے کہ:

"حضرت علیؑ نے جبکہ وہ یمن میں تھے حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کافی مقدار میں قیمتی سامان بھیجا تو حضرتؐ نے اُسے چار آدمیوں پر تقسیم کر دیا۔ اقرع ابن حابس اور عیینہ بن بدر فزاری اور علقمہ بن علاقہ عامری اور زید بن خیل طائی تو قریش اور انصار کو اس پر غصہ آیا اور کہنے لگے کہ یہ نجد کے بڑے بڑے آدمیوں کو دیتے ہیں اور ہمیں چھوڑ دیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ انھیں تو میں تالیف قلب کے لیے دیتا ہوں۔ اس کے بعد ایک شخص آیا جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور پیشانی کی دونوں طرف کی ہڈیاں اونچی تھیں، ڈاڑھی گھنی تھی اور رخسارے پھُولے ہوئے تھے اور سر منڈا ہوا تھا۔ اس نے حضرتؐ کا نام لے کر پکارا اور کہا اللہ سے ڈریے۔ آپؐ نے فرمایا میں اللہ کی نافرمانی کروں گا تو اس کی اطاعت کرنے والا کون ہوگا؟ وہ مجھ پر تمام دنیا جہاں کے لوگوں کے بارے میں بھروسہ کیے ہوئے ہے اور تم لوگ مجھ پر بھروسا نہیں رکھتے ہو۔ مسلمانوں میں سے ایک شخص نے جو میرا خیال ہے خالد بن ولید تھے، حضرتؐ سے اُسے قتل کرنے کی اجازت مانگی تو آپؐ نے اجازت نہیں دی اور جب وہ چلا گیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اُس کی اصل نسل سے ایک گروہ ہوگا کہ قرآن پڑھیں گے اس طرح کہ اُن کے گلوں سے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ اسلام سے یوں نکل جائیں گے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے، وہ مسلمانوں کو قتل کریں اور بُت پرستوں کو چھوڑے رہیں گے۔ میں اگر اُن کو پاؤں تو قتل کروں اس طرح جیسے قبیلۂ عاد کے کسی آدمی کو قتل ہونا چاہیے۔"

دوسری روایت میں ہے کہ کسی نے پوچھا کہ اُن کی علامت کیا ہے؟ فرمایا:

"اُن کی علامت سر کا منڈوانا ہے۔ اس کے لیے "تحلیق" کی لفظ فرمائی یا "تسمید" کی توجب اُنھیں دیکھنا، خوابِ مرگ کا مزہ چکھانا۔"

"نہایہ" میں اس حدیث کے بعض اجزا کے حلِ لغات میں لکھا ہے کہ:

"ضئضئی" کے معنی "اصل نسل" کے ہیں اور "تسمید" اُن میں عام ہوگی۔ "تسمید" کے معنی سر منڈوانے کے ہیں۔ اس طرح کہ بال بالکل نیست و نابود ہوجائیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ یہ شخص ذوالخویصرہ تمیمی تھا۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہیں:۔

ایک یہ کہ نجد والے ایسے مخالفین اسلام میں تھے کہ اُن میں سے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوں، اُن کے لیے اُس طرح تالیفِ قلب کی ضرورت ہوتی تھی جیسے ابوسفیان وغیرہ کی جو "مولفۃ القلوب" کہلاتے تھے۔

دوسرے ابوالخویصرہ تمیمی کے لیے یہ فرمایا کہ اس کی اصل نسل سے ایسے لوگ ہوں گے اور ابن عبدالوہاب کا تمیمی ہونا پہلے معلوم ہوچکا ہے۔ اس لیے یہ ثابت ہوا کہ سب علامات اس جماعت میں وہی ہیں جن کا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پتہ دیا تھا۔ مسلمانوں کا خون بہانا، غیر مسلم بت پرستوں کے خلاف کبھی تلوار نہ اٹھانا، سروں کا گھٹا رکھنا، یہ سب امور مشاہدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہی سے آدمی اُن اوصاف کو کچھ سکتا ہے جو آنکھ سے دیکھنے کے نہیں ہیں۔ جیسے قرآن کا گلے کے نیچے نہ اُترنا اور اسلام سے اس طرح خارج ہونا جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے۔

ایسی ہی اور حدیثیں تلاش سے مل سکتی ہیں جو بالکل نجدی حضرات پر منطبق ہیں اور جنھیں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک معجزہ بھی سمجھنا چاہیے۔

ساتواں باب

وہابیوں کا کرتوت ابتدا سے دورِ حاضر تک

معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لوگ سن ۱۱۶۰ھ میں ظاہر ہوئے اور جب سے سامنے آئے مسلمانوں کی خوں ریزی ان کا شعار رہی اور اُن کے اُس وقت کے حاکم محمد بن مسعود نے محمد بن عبد الوہاب سے بیعت اسی پر کی تھی کہ وہ اُس مسلک کے مخالفین سے جنگ کرے گا۔ اور "راہ خدا میں جہاد" کے نام سے اُن کے خون بہائے گا۔ تو اب ایسی جماعت کا پوچھنا کیا جس کے مذہب کی بنیاد ہی مسلمانوں کے خون بہانے پر ہو، تو جتنا ان کا اقتدار مضبوط ہوتا جائے، انھیں اس امر سے کوئی چیز مانع نہیں ہوسکتی تھی۔ اس لیے جتنی جتنی اُن کے اقتدار میں مضبوطی پیدا ہوئی، ان کی خونریزی میں اضافہ ہوتا گیا۔ علاوہ خون بہانے کے کتنے ہی ناموسوں کی بے حرمتی ہوئی، کتنی عورتوں کو قید کیا اور انھیں کنیز بنایا۔ کتنے ہی بچوں کو قتل کیا اور یہ تمام مظالم مسلمانوں پر ہوے اور اپنے اقتدار کی پوری عمر میں اُنھوں نے غیر مسلم آدمیوں میں سے کسی کا خون نہیں بہایا۔

جب نجد کے جاہلوں میں اُن کا سکہ بیٹھ گیا تو اُن کے ظلم و تعدی کا قدم آگے بڑھا اور سعود بن عبد العزیز بن محمد بن مسعود کے دور میں کئی مرتبہ عراق پر حملہ کیا۔ چنانچہ بزرگ مرتبہ شیعہ عالم سید محمد جواد عاملی نے اپنی کتاب "مفتاح الکرامہ" میں ضمان اور شفعہ اور وکالۃ کی جلدوں کے آخر میں ان مظالم کا چشم دید تذکرہ کیا ہے

اور اسی زمانے میں یہ حرمین شریفین میں داخل ہوئے اور شریف مکہ اور اُن میں سنہ ۱۲۰۵ھ سے سنہ ۱۲۲۰ھ تک مسلسل جنگ ہوئی جس میں شریف مکہ کو شکست ہوئی اور انھوں نے حرمین شریفین کو "دار الحرب" قرار دے کر وہاں قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور حجرۂ نبوی میں جتنے اموال اور جواہرات تھے سب لوٹ کر انھیں اپنی مرضی سے صرف کر ڈالا۔ اس کا تفصیلی ذکر تاریخ "عجائب الآثار" جبرتی میں ہے۔ حالانکہ مختلف مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مصنف خود وہابیت کی طرف میلان رکھتا تھا اور مسلمانوں کو حج سے روک دیا اور موسم حج پر اعلان کیا گیا کہ اے صاحبان ایمان مشرکین نجس ہیں تو وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آئیں۔ یہ نتیجہ ہوا کہ سنہ ۱۲۲۱ھ سے شام و مصر کے حاجیوں کا آنا بند ہو گیا جس کا ذکر خلاصۃ الکلام احمد بن زینی دحلان میں موجود ہے۔

اور سنہ ۱۲۲۳ھ میں اُس وقت کے ابن سعود نے مکے والوں سے کہا کہ قبے جتنے ہیں وہ گرا دیے جائیں اور ان بتوں کو ختم کیا جائے تاکہ سوا اللہ کے کوئی معبود نہ رہے چنانچہ دوسرے دن، لوگ پھاوڑے لیے ہوئے اِدھر اُدھر متبرک آثار اور قبوں کے گرانے کے لیے روانہ ہو گئے۔ چنانچہ سب سے پہلے جنۃ المعلی کے قبے گرائے جو بڑی تعداد میں تھے۔ پھر مولد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مقام ولادت ابوبکر اور مزار جناب خدیجہؓ کے قبے گرائے۔ اور تمام ان مقامات کو مسمار کیا جو آثار مقدسہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور وہ گراتے وقت رجزیں پڑھ رہے تھے اور ڈھول بجا رہے تھے اور گا رہے تھے اور اہل قبور کو گالیاں دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ سب وہ معبود ہیں جو لوگوں نے تراشے ہیں۔ اس سب کا ذکر علامہ ابن دحلان نے اپنی تاریخ "خلاصۃ الکلام" میں کیا ہے۔

اسی طرح مدینے کی قبروں کو منہدم کیا گیا سوا قبۂ نبوی کے اس کے علاوہ تمام قبور مقدسہ اور آثار متبرکہ کو خصوصیت کے ساتھ جنت البقیع کے مزارات کو منہدم کیا۔ یہ اُن کے حرکات برابر جاری رہے، یہاں تک کہ مصر کی فوجیں آئیں اور انھوں نے ان کو یہاں سے نکلنے پر مجبور کیا اور اس سلسلے میں جنگ بڑی شدت سے جاری رہی۔ یہاں تک کہ بالآخر نجدی فوج کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کا لشکر فتحیاب ہوا اور شعبان سنہ ۱۲۳۴ھ میں محمد علی پاشا حاکم مصر کا حکم نجد میں مصری فوج کے سالار ابراہیم پاشا کے پاس پہونچا جو درعیہ تک پہونچ چکے تھے کہ شہر درعیہ کو مسمار کر دیں چنانچہ مصری فوج نے تیزی کے ساتھ اس شہر کو مسمار کر دیا اور آگ لگا دی اور وہاں کے باشندے سب اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ لیکن حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے خوارج کے لیے پہلے ہی خبر دی تھی کہ یہ بالکل ختم کبھی نہیں ہوں گے۔ جب ایک شاخ ان کی قطع ہو گی، دوسری شاخ پیدا ہو جائے گی چنانچہ کچھ مدت گذرنے کے بعد پھر انھوں نے سر اٹھایا۔

پھر عراق آئے اور کربلائے معلی میں شہر کے اندر داخل ہو کر ہزاروں مومنین کو تہ تیغ کیا اور حرم اقدس کی توہین کی۔ بالکل اُس طرح جیسے مسلم بن عقبہ یزیدی فوج کے افسر نے معرکہ حرہ کے بعد حرم مدینہ کے اندر کیا تھا کہ وہاں نجاستوں کا انبار کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ضریح اقدس کو اکھاڑ ڈالا اور جو کچھ حرم اقدس کا خزانہ تھا، سب لوٹ لیا۔ پھر نجف اشرف میں داخل نہیں ہو سکے حالانکہ کئی دن تک وہاں محاصرہ رکھا مگر قدرت کی طرف سے انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور بہت سے آدمیوں کے اتلاف جان کے بعد وہ نامراد واپس ہوئے۔

اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک وہ زیادہ سر نہیں اٹھا سکے۔ بس اپنے نجد کے شہروں میں محدود رہے۔ یہاں تک کہ اب آخر میں انگریزوں کی بدولت انھیں آگے بڑھنے کا ایسا موقع ملا کہ نجد کا حاکم سلطان نجد و حجاز اور والی حرمین ہو گیا۔ اور اب انھوں نے وہ ظلم و ستم کیا اور شعائر الٰہی کی بے حرمتی کی جس سے اسلام اور مسلمانوں کے دلوں میں گھاؤ پڑ گئے ہیں۔ اس وقت کے عبد العزیز آل سعود نے برسر اقتدار آ کر پہلے تو طائف میں قتل عام کیا اور ترجمان القرآن، امام المفسرین، حبر الامۃ عبد اللہ ابن عباسؓ کے قبے کو منہدم کر دیا [illegible]

مکۂ معظمہ میں جتنے قبے تھے ان سب کو گرایا جن میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جدِ امجد جناب عبد المطلب کا قبہ تھا اور آپ کے عمِ نامدار جناب ابو طالب کا قبہ اور آپ کی زوجۂ طاہرہ اُم المومنین جناب خدیجہ کا قبہ اور آپ کی مادرِ گرامی جناب آمنہ بنت وہب کا قبہ، ان سب کو مسمار کر دیا۔

ان حضرات کے ذاتی فضائل و مراتب کے علاوہ اس حیثیت سے دیکھا جائے کہ ان میں سے اکثر سربرآوردہ قبیلۂ قریش کے افراد تھے جن کے بارے میں خود ان نجدیوں کے پیشوا امام احمد بن حنبل کے مسند میں حدیث ہے کہ:

"حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قریش کی توہین کی، اس کی خدا توہین کرے گا۔"

اور اس کچھ شک نہیں ہو سکتا کہ قبر کا مسمار کرنا صاحبِ قبر کی توہین ہے۔ اور حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ایک قبر سے تکیہ لگائے بیٹھا ہے۔ حضرت نے فرمایا صاحبِ قبر کو اذیت نہ پہونچاؤ اور ابن ابی شیبہ نے عبداللہ بن مسعود سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا مومن کو اذیت دینا اُس کی موت کے بعد مثل اذیت دینے کے ہے اُس کی زندگی میں اور ہمیں انھوں نے مومن کو ایذا پہونچانے سے ممانعت کی ہے۔ اب ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ کسی کا گھر گرا دیا جائے تو زندگی میں اُسے اذیت ہو گی یا نہیں؟ تو اسی صورت سے قبر پر پھاوڑے چلائے جائیں تو یقیناً اُس میت کو ایذا ہو گی جس کی وہ قبر ہے اور جب یہ اصحابِ قبور کو ایذا پہونچانا ہے تو اب قرآن کی یہ آیت پڑھیے کہ

"جو لوگ مومنین اور مومنات کو بلا جرم و خطا ایذا پہونچائیں انھوں نے بڑے گناہ کا بوجھ اٹھایا۔"

طائف اور مکۂ معظمہ میں اُن کے یہ افعال مسلمانانِ عالم میں بے چینی پیدا کرنے کے لیے کافی تھے کہ پھر مدینۂ منورہ کے تمام مآثر و آثارِ مقدسہ کو منہدم کیا اور جنۃ البقیع

کے تمام قبوں کو مسمار کیا جن میں ازواجِ رسولؐ، اقربائے رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کی قبریں تھیں جیسے عثمان بن مظعون جنھیں خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دفن کیا تھا اور اُن کی قبر کے نمایاں کرنے میں اہتمام فرمایا تھا جس کا ذکر اس کتاب میں پہلے ہو چکا ہے اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد بزرگوار جناب عبداللہ اور حضرتؐ کے فرزند جناب ابراہیم اور آپ کے چچا عباس ابن عبد المطلب اور چچا زاد بھائی جناب عقیل اور صحابی عبداللہ بن مسعود اور عبد الرحمن بن عوف وغیرہ اور سب سے بڑھ کر حضرت خاتونِ جنت جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا مزار مبارک جہاں بہت سے علمائے اہلِ سنت جیسے مومن سبلنجی "نور الابصار" میں اور محمد بن صبان "اسعاف الراغبین" میں اور ابو العباس احمد بن یوسف دمشقی "اخبار الدول" اور "آثار الاول" میں اور علی بن برہان الدین شافعی "انسان العیون" میں اور ابن عبد البر کتاب "الاستیعاب" میں اور دوسرے مصنفین حضرت سیدہؑ کی قبر ہونے کے قائل ہیں جن کے لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاف حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے کہ

"جس نے ان کو اذیت پہونچائی اُس نے مجھے ایذا پہونچائی۔"

اور یہ حدیث پہلے آ چکی ہے کہ

"جو بعدِ موت ایذا پہونچائے، وہ ایسا ہی ہے جیسے زندگی میں ایذا پہونچاتے۔"

تو اس کے بعد قرآن کی یہ آیت پڑھنا چاہیے جس کا مضمون یہ ہے کہ

"جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کو ایذا پہونچاتے ہیں، اُن پر اللہ کی لعنت ہے دنیا اور آخرت میں اور اُن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔"

ان سب کے علاوہ اُس قبے کو منہدم کیا جس میں ائمہ اہلبیت علیہم السلام میں سے چار ہستیاں ——————

۱۔ سبطِ اکبر حضرت امام حسن علیہ السّلام

۲۔ زین العابدین امام علی بن الحسین علیہ السّلام

۳۔ باقر العلوم الاولین والآخرین امام محمد بن علی علیہ السّلام اور

۴۔ صادق آلِ محمد امام جعفر بن محمد علیہ السّلام

یہ سب حضرات مدفون تھے جن کے مناقب و فضائل معتبر کتب اہلِ سنت میں بھی موجود ہیں اور یہ قبّہ جس میں یہ حضرات دفن تھے، تمام مسلمانوں کے نزدیک خاص احترام و تقدّس رکھتا تھا۔ چنانچہ علامہ ابن حجر مکّی صواعق محرقہ میں لکھتے ہیں امام جعفر صادق علیہ السّلام کے حال میں کہ

"آپ بھی اُس قبّے میں دفن ہوئے تو کیا کہنا اُس قبّے کا کتنا بزرگ مرتبہ اور متبرک اور شریف ہے۔"

اور محدّث محمد پارسا بخاری نے "فصل الخطاب" میں امام زین العابدین علیہ السلام کے حال میں لکھا ہے کہ

"آپ اُس قبّے میں دفن ہوئے جس میں اس سے پہلے رسولؐ کے چچا عباس اور خود آپ کے چچا امام حسنؑ دفن ہو چکے تھے۔ اور آپ کے بعد اس میں آپ کے فرزند محمد باقرؑ اور پھر اُن کے بیٹے جعفر صادقؑ دفن ہوکر تو کیا کہنا اس قبّے کا کہ کتنا بزرگ اور صاحبِ شرافت یہ قبّہ ہے۔"

ایسے ہی اور علماء کے کلمات بھی ہیں۔

اور اس قبّے کے انہدام سے بلا تفریق شیعہ و سنّی مسلمانوں کو کتنا رنج پہونچا، اُس کا اندازہ خواجہ حسن ثانی نظامی کے حسبِ ذیل تاثرات سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے ماہنامہ "منادی" نئی دہلی کے دسمبر ۱۹۶۸ء کے شمارے میں "ایران و عراق کے زیارت نامے" میں روضۂ امام رضا علیہ السلام کے حالات درج کرنے کے بعد لکھے ہیں:

"یہاں کے کیفیات کے ساتھ مدینۂ منورہ کا تصوّر بندھ جاتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے بقیع کا قبرستان آجاتا ہے۔ سب شکستہ، سب بے سایہ، نہ گنبد، نہ قبرپوش، نہ پھول، نہ کسی درخت کی چھاؤں، نہ گھانس کی دو پتیاں۔

میری عقل حیران ہے کہ جب رسولؐ حجرے میں آرام فرما سکتے ہیں، جب رسولؐ کی آرام گاہ پر گنبد بن سکتا ہے۔ جب حضرت ابوبکر اور حضرت عمر حجرے میں مدفون ہو سکتے ہیں اور ان کو وہاں دفن کرنے والے صحابہ، وہ صحابہ جنھوں نے رسولؐ کی آنکھیں دیکھیں۔ جنھوں نے اسلام کو اسلام لانے والے سے براہِ راست سیکھا، ان میں سے کوئی بھی حجروں کے اندر، عمارتوں کے نیچے، دفن ہونے میں کوئی بُرائی نہیں دیکھتا تو پھر آج مقبروں کو ڈھانے اور مسمار کرنے کا حق کسی کو کیسے پہونچ جاتا ہے؟ کیا یہ قبر شکن صحابہ سے زیادہ دین کو سمجھ سکتے تھے؟ خاکم بدہن کیا صحابۂ کرام ان لوگوں کے مقابلے میں کم دیندار تھے؟ نعوذ باللہ من ذالك"

بات اصل میں یہ ہے کہ خیر و شر اور حق و ناحق کا مقابلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

مکّہ اور طائف کی ایذا رسانیاں،

بدر و اُحد کی چڑھائیاں،

صفّین و کربلا کے معرکے،

سلسلہ در سلسلہ آج بھی موجود ہیں، محمدؐ اور محمد والوں کو (علیہم السّلام) دنیا کی آزمائش گاہوں میں ہر طرح صبر و ثبات کا نمونہ دکھانا ہے۔ جب بھی دکھایا، اب بھی دکھا رہے ہیں۔

اللہ مدینے کے سبز گنبد کو سلامت رکھے، اگر اس کا بننا اور سلامت رہنا جائز ہے

تو کیا اس دُکھ کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے جو اس سبز گنبد کے مکین کو اپنی لاڈلی بیٹی فاطمہؑ اور اپنے چہیتے نواسے حسن اور دوسرے کتنے ہی پیاروں کی شکستہ قبروں اور بے سایہ مزاروں پر ہوتا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ اُس دن کی صبح کسی مسلمان کو نصیب نہ کرے جس دن اُس کے قول و عمل سے رسولؐ کو دُکھ پہونچے۔

تمام شد

علی نقی النقوی

(تہران) جمہوری اسلامی ایران

کتابیات

خلافت و امامت

تاریخ نجد

التوحید الذی ھو حق اللہ علی العبید۔ ابن عبد الوہاب

مسلم

بخاری

نہج البلاغہ

جوہر منظم فی زیارۃ قبر النبی المکرم } علامہ ابن حجر مکی

اشرف الوسائل الی فہم الشمائل } علامہ ابن حجر مکی

حل المعاقد حاشیہ شرح عقائد۔ مولانا عبد الحلیم فرنگی محلی

درر کامنہ۔ جلد اول۔ ابن حجر مکی

تاریخ ذہبی

مراۃ الجنان یافعی

تاریخ ابو الفداء

خلاصۃ المقال فی شد الرحال سید مصطفیٰ نور الدین حسین

انسان العیون ؛ علی بن برہان الدین شافعی

شفاء السقام فی زیارۃ خیر الانام۔ قاضی القضاۃ شیخ حافظ تقی الدین سبکی

منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشد الرحال۔ مفتی صدر الدین

اتحاف اھل العرفان برؤیۃ الانبیاء والملائکۃ والجان۔ شیخ محمد برنسی

نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض۔ احمد بن شہاب الدین خفاجی
شرح شفاء۔ ملا علی قاری
کشف الظنون
مستدرک۔ حاکم
معجم کبیر طبرانی
اوسط طبرانی
ابو نعیم۔ حلیۃ الاولیاء
جامع کبیر۔ حافظ سیوطی
خصائص کبریٰ۔ جلال الدین سیوطی
دلائل بیہقی
تاریخ بخاری
کتاب المعرفۃ۔ ابو نعیم
شرح دلائل الخیرات
بہجۃ المحافل۔ عماد الدین عامری
دلائل النبوۃ۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی
البیان والتبیین۔ جاحظ
اسد الغابہ۔ ابن اثیر جزری
استیعاب ابن عبد البر
زاد المعاد۔ ابن قیم
تاریخ ابن خلکان
سنن ابن ماجہ
حاشیہ سنن ابن ماجہ۔ محدث سندی
مواہب لدنیہ۔ قسطلانی

حصن حصین۔ علامہ شمس الدین جزری
جذب القلوب۔ شاہ عبد الحق محدث دہلوی
شفاء۔ قاضی عیاض۔
اوراق بغدادیہ۔ سید ابراہیم راوی رفاعی
وفاء۔ سمہودی
تذکرۃ السامع والمتکلم۔ شیخ بدر الدین ابن ابراہیم بن سعد اللہ بن جماعۃ کنعانی
ادب الاملاء والاستملاء۔ عبد الکریم سمعانی۔
محاضرۃ الابرار۔ شیخ محی الدین ابن عربی۔
اصابہ۔ حافظ ابن حجر۔
حاشیہ اقناع۔ شیخ منصور حنبلی۔
محاضرۃ الاوائل۔
جمع بین الصحیحین
مسند احمد
سنن ابن داؤد
تاریخ نجد۔ آلوسی
تفسیر کبیر۔ امام فخر الدین رازی
کتاب العالم والمتعلم امام ابو حنیفہ
جامع کبیر۔ جلال الدین سیوطی۔
عمل الیوم واللیلۃ۔ حافظ ابو نعیم اصفہانی
کتاب الدعوات۔ حافظ جلال الدین سیوطی
خیرات حسان فی مناقب الامام ابی حنیفۃ النعمان۔ ابن حجر عسقلانی
بانی درس نظامی۔ مفتی محمد رضا انصاری
فتویٰ جواز یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ۔

ینابیع المودة ۔ شیخ سلیمان بلخی قندوزی

کفایہ شعبی

فتاوای غرائب

مطالب المومنین

خزانۃ الروایہ

ابجد العلوم ۔ نواب صدیق حسن خان قنوجی ۔

محو الحوبۃ فی شرح ابیات التوبہ ۔ محمد بن اسمعیل صنعانی

رد المحتار ۔ سید محمد امین بن عمر معروف با بن عابدین

توضیح ۔ سلیمان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد الوہاب ۔

الحصن والجنۃ علی عقیدہ اہل السنۃ ، شیخ محمد یوسف مشہور بلقب کافی

شرح التوحید

کشف الشبہات فی التشکیک بالمتشابہات ۔ محمد بن عبد الوہاب

کشط الاباب

زاد المعاد فی ہدی خیر العباد ۔ ابن قیم

کتاب الام ۔ شافعی

وفاء الوفاء ۔

صواعق محرقہ ، علامہ ابن حجر مکی ۔

اوراق بغدادیہ ۔

معالم التنزیل بغوی

لباب التاویل ۔ خازن ۔

تفسیر جلالین ۔

کشاف

ابوالسعود

تنویر المقباس ابن عباس

غرائب القرآن ۔ نیشاپوری

شرح صحیح مسلم ۔ نووی

صراط مستقیم ۔ شیخ تقی الدین ابن تیمیہ

العدل الشاہد فی تحقیق المشاہد ۔ عثمان بن بدوخ شافعی

فصل الخطاب ۔ محدث خواجہ پارسا بخاری

رسالہ ام القری ۔ ۱۴ رجمادی الثانی ۱۳۴۵ھ ۔ لعبد اللہ ابن سلیمان

عمدۃ الطالب ۔ جمال الدین ابن عنبہ

حبیب السیر ۔

کامل ابن اثیر ۔

روضۃ الصفاء

تاریخ الخلفاء ۔ سیوطی

در المختار

شرح مشکوٰۃ

مجمع البحار ۔ محدث محمد طاہر گجراتی

وسائل الشیعہ ۔ شیخ حر عاملی

مصباح المنیر ۔ فیتومی ۔

تفسیر روح المعانی ۔

زہر الربیٰ حافظ سیوطی

تفسیر بیضاوی

حاشیہ سنن نسائی ۔ علامہ سندی مدنی

کنوز الحقائق ۔ مناوی

فتح الباری

احیاء العلوم ۔ غزالی

نہایہ ۔ ابن اثیر

الاعلام ۔ بیت اللہ الحرام

تحفۃ الباری

ارشاد الساری

علامہ سید حسن صدر طاب ثراہ

کتاب العلل والسؤالات ۔ عبداللہ ابن احمد بن حنبل

علامہ محقق کمال بن ہمام

مستدرک المسائل ۔ علامہ نوری

صحاح جوہری ۔

تہذیب ۔

قاموس الامکنہ والبقاع

خلاصۃ الکلام ۔ احمد بن زینی دحلان

بحار الانوار ۔ علامہ مجلسی

مفتاح الکرامہ ۔ سید محمد جواد عاملی

تاریخ عجائب الآثار جبرتی

نور الابصار ۔ مومن شبلنجی

اسعاف الراغبین ۔ محمد بن حیان

اخبار الاول ۔ ابو العباس احمد بن یوسف دمشقی

آثار الاول ۔ " "

کتاب الاستیعاب ابن عبدالبر

رسالہ منادی ۔ ماہ دسمبر ۱۹۶۸ء ۔ خواجہ حسن ثانی نظامی ۔ نئی دہلی ۔